بیاد

محدثِ کبیر عالمِ ربانی حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

الجامعۃ المدنیۃ

کریم پارک راوی روڈ لاہور

7704595, 7720187

حمد باری تعالیٰ

(ماہر القادری)

خدا کے نام سے ہر ابتدائے کار کریں
اسی کی راہ میں ہرچیز کو نثار کریں
یہی تو دل کی سعادت ہے نطق کی معراج
خدا کی حمد کریں اور بار بار کریں
مسّرتیں ہوں تو شکرِ خدا بجا لائیں
مصیبتیں ہوں تو ہم صبر اختیار کریں
یہ کیا کہا کہ نگاہِ کرم نہیں ہوتی
گناہگار گناہوں کا بھی شمار کریں
اسی میں دل کا سکوں ہے یہی ہے عقل کی بات
خدا رسولؐ کی باتوں پر اعتبار کریں
ہر ایک پھول چمن کا ، خدا کی آیت ہے
اسی نگاہ سے نظارۂ بہار کریں

علمی دینی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

الحامد

لاہور

جلد نمبر: 3 | محرم الحرام ۱۴۳۲ھ / دسمبر ۲۰۱۰ء | شمارہ نمبر: 7

فی شمارہ: 30 روپے، ششماہی: 150 روپے، سالانہ: 300 روپے

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ
ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط
بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش 20 امریکی ڈالر

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر

دفتر "الحامد" جامعہ مدنیہ کریم پارک، راوی روڈ لاہور

مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "الحامد" لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

اداریہ

فطرت انسانی

تسلیم یا گریز

مدیر کے قلم سے

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کو خارجی ہدایات سے محفوظ رکھا ہے۔ جس کو جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، اسکی فطرت گردوپیش سے دائمی تاثر لیے بغیر ہمیشہ اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ ہیرا برسہا برس مٹی کی تہہ میں رہے لیکن جو چمک اس کی فطرت میں شامل ہے۔ مٹی اسے چھپا تو سکتی ہے، مٹا نہیں سکتی۔

وہ لوگ جو اس نظریے کے قائل تھے کہ فطرت خارجی رہنمائی سے اپنی اصل تبدیل کر لیتی ہے، اپنے مخالفین سے جا بھڑے اور طے یہ ہوا کہ اپنے اپنے دعاوی کو منطقی اور سائنسی دلائل (Logical & Scientific Arguments) سے ثابت کیا جائے۔ چنانچہ فریقین کا اجتماع ایک ساحل سمندر پر ہوا، ریت میں ایک گڑھا اس طرح کھودا گیا، کہ اسکے ایک طرف ہوا چل رہی تھی، دوسری طرف دھوپ پڑ رہی تھی، تیسری طرف سمندر تھا اور چوتھی طرف آگ کا اَلاؤ لگا دیا گیا۔ ان چاروں کے بیچ میں ایک گڑھا اور اس میں کچھوے کے ایسے انڈے رکھ دیئے گئے جن میں کچھوے کے زندہ بچے باہر آنے کے لیے بیتاب تھے۔ چنانچہ ان بچوں نے انڈوں کا وہ خول توڑا اور جونہی باہر آئے فوراً سمندر کا رُخ کیا اور پانی میں جا تیرنے لگے۔

ان لوگوں کی جیت ہوئی جن کا نظریہ تھا کہ فطرت برابر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ خارجی رہنمائی سے بے نیاز اور بغیر کسی تعلیم کے کچھوے کے یہ بچے ہوا، آگ اور مٹی سے منہ موڑ، جو پانی کی طرف بڑھے تو یہ ان کی فطرت ہی تھی، جو کہ بغیر کسی خارجی تعلیم کے ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔

انسان کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ فطرت ہمیشہ اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے حالات کیسے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں اور معاشرتی مسائل کیسے ہی پیچیدہ ہو جائیں، انسانی فطرت اپنا کام نہیں چھوڑتی۔ اپنی اصل سے نہ وہ تبدیل ہوتی ہے اور نہ ہی موت کا شکار ہاں کبھی مسخ ہوتی ہے لیکن یہ مسخ بھی دائمی اور ابدی نہیں ہوتا

کوئی نہ کوئی جھٹکا (خواہ موت ہی کا کیوں نہ ہو) اسے اُپنی اصل کی طرف لوٹا دیتا ہے۔اس لیے جولوگ فطرت سے ٹکر لیتے ہیں ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔بھوک اور پیاس انسانی فطرت میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تسکین کا سامان کھانے اور پانی پینے میں رکھا ہے۔ایک شخص بھوک مٹانے کی غرض سے کھانا کھانے کی بجائے مٹی پھانکنے اور پتھر منہ میں ڈالنے لگے تو اس سے یہ تو ممکن ہے کہ اس کا معدہ بھر جائے لیکن بھوک نہیں مٹے گی اور اس صورت میں انجام موت تو نکل سکتا ہے بھوک کی تسکین نہیں۔ پیاس لگنے پر پانی پینا، اس کو بجھانے کا ایک فطری طریقہ ہے ایک فرد پانی کی بجائے تیل پینے لگے تو نہ رگیں تر ہوں گی اور نہ جگر ٹھنڈا ہوگا، ہاں یہ ممکن ہے کہ گلے کے کانٹے تر ہو جائیں۔اس لیے فطرت سے فرار نہ صرف دنیا کو تباہ کر دیتا ہے بلکہ آخرت کی زندگی کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

جنس (Sex) کی بھوک بھی انسان کی فطرت میں شامل ہے اور بنانے والے نے اس کی تسکین نکاح میں رکھی ہے۔ شوہر کو بیوی کی قربت اور بیوی کو شوہر سے جو تسکین ملتی ہے اس کا کوئی بدل اس دنیا میں موجود نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط.

(پ: ۲۱، س: الروم، آیت: ۲۱)

اور اللہ تعالیٰ کے ہونے کے دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تمہاری نوعِ انسانی میں سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس جا کر چین حاصل کرو اور پھر اس نے ہی تو تمہارے درمیان پیار اور رحمت کے جذبات رکھے ہیں۔

یہ بات فطرت انسانی میں رکھ دی گئی کہ جنس کی تسکین نکاح میں ہے۔اب جو شخص بھی اس فطرت سے گریز کر کے جنسی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ ناکام رہے گا۔ یہ آگ وقتی طور پر تو بجھ سکتی ہے اور انسان درجۂ انسانیت سے گر کر حیوانیت کی سطح تک جا سکتا ہے لیکن اگر وہ سکون اور پیار کا متلاشی ہے تو پھر نکاح کے علاوہ فطرت نے اس دنیا میں اس کا کوئی حل نہیں رکھا۔انسان ہر دور میں اس ایک اور صرف ایک فطری طریقے کے علاوہ دوسرے غیر فطری طریقوں سے اپنی جنسی تسکین چاہتا رہا ہے، لیکن پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے اپنے وضع کردہ طریقوں سے کبھی بھی یہ تسکین حاصل نہیں ہو سکی۔اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی فطری طریقے کی طرف لوٹا جائے۔اسے برقرار رکھا جائے اور ہر نئی نسل انسانی فطرت کی اس راہ سے گریز کرنے کی بجائے اسے تسلیم کرے ورنہ دنیا میں تو نہیں تسکین ملے گی، پورا امکان اور اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں آخرت بھی تباہ نہ ہو جائے۔

✿✿✿✿

درس قرآن مجید

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا م یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِھٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ

ہاں واقعی اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی مثال بیان کرے خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ہو۔ تو جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ مثال ان کے رب کی جانب سے بالکل ٹھیک یعنی باموقع ہے اور رہے وہ لوگ جو منکر ہیں سو خواہ کچھ ہو جائے وہ یہی کہیں گے آخر اس مثال سے اللہ کا مقصد کیا ہے اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اسی مثال سے بہت سوں کو راہ پر لے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا مگر صرف نافرمانوں کو ﴿۲۶﴾ وہ نافرمان وہ ہیں جو اللہ سے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد عہد شکنی کرتے ہیں اور وہ ان تعلقات کو توڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ ملک میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں بس یہی لوگ ہیں پورا نقصان اٹھانے والے۔ ﴿۲۷﴾

تفسیر: ہاں! بے شک اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ خواہ وہ کوئی سی مثال بیان کرے۔ وہ مثال مچھر کی ہو یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ہو۔ پھر جو اہلِ ایمان ہیں وہ تو خوب جانتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ

کی نازل کردہ اور بیان کردہ مثال بالکل درست اور بہت باموقع ہے۔ اور وہ لوگ جو کفر کی روش اختیار کر چکے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ آخر اس مثال کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کون سا مقصد اور مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ اس نازل کردہ مثال سے بہتوں کو گمراہ رکھتا ہے اور اسی مثال سے بہت سوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا اور نہ کسی کو گمراہی پر قائم رکھتا ہے۔ مگر صرف ان لوگوں کو جو ایسے نافرمان و بدکردار ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس عہد کو مضبوط و مستحکم کرنے کے بعد عہد شکنی اور نقضِ عہد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور وہ ان تعلقات کو توڑتے اور قطع کرتے ہیں۔ جن کے ملانے اور جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور وہ زمین میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔ بس یہی لوگ حقیقی زیاں کار اور دیوالیے ہیں۔

ان آیتوں کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے۔ ہر بحث میں یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ مدعی اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کرتا ہے اور اسی کے ساتھ مقابل کی دلیل کا بھی جواب دیتا ہے۔ یہاں بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صداقت اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایک دلیل پیش کی، جس کا جواب منکر نہیں دے سکتے۔ اب منکرین کی اس دلیل کا جواب دیتے ہیں جو انہوں نے بطور معارضہ پیش کی تھی۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اِس قرآن کے جواب میں کوئی چھوٹی سی سورت بھی اِس جیسی نہیں لاسکتے لیکن اِس قرآن میں بعض ایسی مثالیں بیان کی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے۔ اگر خدا کا کلام ہوتا تو اِس میں ایسی حقیر اور ذلیل چیزوں کی مثالیں مذکور نہیں ہوتیں۔ جیسے مچھر کی اور مکڑی کی اور مکھی کی مثالیں۔

حالانکہ کفار کا یہ معارضہ نہایت ہی بے معنی تھا۔ اس لئے کہ مثال تو محض دعویٰ یا دلیل وغیرہ کی توضیح کے لئے بیان کی جاتی ہے۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ مثال سے ممثل لہٗ کی توضیح ہوگئی یا نہیں؟ عام اس سے کہ وہ مثال خواہ کتنی ہی حقیر اور ذلیل ہو یا کتنی ہی بڑھیا اور اعلیٰ درجہ کی ہو، اور یہ طریقہ مثال دینے کا اللہ تعالیٰ کی شان ارفع و اعلیٰ کے کچھ منافی بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہ طریقہ سب بڑے چھوٹوں کے کلام میں شائع اور رائج ہے۔ اس میں کوئی شرم یا ننگ و عار کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ مچھر کی مثال بیان فرمائے یا اس سے کسی بڑی چیز مکڑی اور مکھی کی مثال بیان فرمائے۔

شرم کی نفی کرنے کے بعد مثال کے نتائج کے لئے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو مثال بھی بیان فرماتا ہے اس کا ایک

اثر تو اہلِ ایمان پر ہوتا ہے اور اس کا دوسرا اثر کفار اور فساق پر ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان تو اِس مثال کو مناسب اور با موقع جانتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن کافر یہی کہتے رہتے ہیں کہ اِس مثال کے بیان کرنے سے اللہ کا ارادہ اور اُس کی غرض کیا ہے؟ وہ خدا کا کونسا مطلب ہے جو اِس مثال سے وابستہ ہے۔ جس طرح بارش کا ایک اثر تو عمدہ زمین پر ہوتا ہے اور دوسرا ناقص اور شورزمین پر ہوتا ہے۔ ایک اچھی اور مقوی غذا کا ایک اثر تو تندرست پر ہوتا ہے اور دوسرا اثر مریض پر ہوتا ہے، ٹھیک وہی حالت یہاں ہے۔

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کے خالق ہیں اس لئے گمراہ رکھنے کی نسبت اپنی طرف کی۔ جیسے نمرود کے بارے میں ارشاد ہے: ''**حآج ابراھیم فی ربه ان اتٰه اللّٰه الملک**'' یعنی نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کے بارے میں محض اس وجہ سے کج بحثی شروع کردی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت عطا کی تھی حالانکہ نمرود کو سلطنت اس غرض کے لئے نہیں دی تھی۔ لیکن اس کی خبیث طبیعت پر حکومت جیسی اچھی چیز کا الٹا اثر مرتب ہوا۔ اسی طرح یہاں بھی حضرت حق نے اس مثال کے اثر کا ذکر فرمایا ہے کہ مثال کا اصل مقصد تو ممثل لہٗ کی توضیح تھی لیکن اس کا اثر ان بدبختوں پر یہ مرتب ہوا کہ الٹے اور گمراہ ہو گئے۔

اور ایک اچھی بات کا ان کی بداعمالی کی باعث ان کی طبیعتوں پر الٹا اثر نمایاں ہوا۔ اس لئے فرمایا کہ بہت سوں کو اس مثال سے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیتا ہے اور گمراہی کے جراثیم جو، ان میں پہلے سے موجود تھے اور قوی ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا اور ان کی رہنمائی فرماتا ہے اور ان کو یہ عمدہ غذا انگ لگتی ہے اور ان کی روحانیت اور ان کے ایمان کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اسی سلسلے میں اُن کے اُن امراض کا بھی ذکر کر دیا، جن امراض کے باعث دوا اور غذا کا اثر مضرت رساں ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو نافرمان ہیں۔ فسق کے اصل معنی تو حدِ اعتدال سے نکل جانے کے ہیں۔ لیکن شرعی اصطلاح میں فاسق اس کو کہتے ہیں جو کبائر کا مرتکب ہو اور احکام الٰہی کی قیود سے باہر نکل جاتا ہو۔ فاسق کے مختلف درجے ہیں۔ کیونکہ کبھی تو اتفاقاً گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور کوئی فاسق ایسا ہوتا ہے کہ اسے کبائر میں پورا انہماک رہتا ہے، اور کوئی ایسا ہوتا ہے جس کو انہماک کے ساتھ اصرار اور ضد ہوتی ہے۔ یہ آخری حالت مریض کے سخت خطرے کی حالت ہے۔ (**العیاذ باللّٰہ**)

یہاں ان فاسقوں کی تین باتیں ذکر فرمائیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد عہد شکنی۔ اور

دوسرے ان تعلقات کوتوڑنا جن کے ملانے اور جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور زمین میں مفسدانہ روش اختیار کرنا ۔عہد سے مراد، ہوسکتا ہے کہ وہی ''الست بربکم'' کا عہد ہو یا وہ عہد جو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور کتابوں کے نازل کرنے سے ہوتا ہے کہ بندوں کی طرف سے بطور عبودیت یہ اقرار ہوتا ہے کہ ہم سب ان چیزوں کو مانیں گے۔ ملانے والے تعلقات سے مراد وہ تمام تعلقات ہو سکتے ہیں جو شرعی طور پر مقرر کئے گئے ہیں۔ خواہ وہ بندے اور پروردگار کا تعلق ہو یا گود پیٹ کے رشتے اور قرابت داری کے تعلقات ہوں، یا انبیاء اور علماء اور صلحاء کے تعلقات ہوں، یا بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کے تعلقات ہوں۔

غرض ہر قسم کے تمام وہ تعلقات مراد لئے جا سکتے ہیں جن کو شریعت نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح شرارت اور فساد بھی عام ہے۔ خواہ قتل و غارت گری اور ظلم ہو، خواہ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو روکنا اور مسلمانوں کو بہکانا ہو۔ خواہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنا ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر مفید تر مثالوں کا اُلٹا اور مضر اثر ہوتا ہے اور یہی لوگ آخرت میں دیوالیے اور ٹوٹا اٹھانے والے ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''قرآن شریف میں کہیں مثال فرمائی ہے مکڑی کی کہیں مکھی کی۔ اس پر کافر عیب پکڑتے تھے کہ اللہ کی شان نہیں ان چیزوں کا ذکر کرنا۔ یہ کلام اس کا ہوتا تو ایسی چیزیں مذکور نہ ہوتیں۔ اس پر یہ دو آیتیں نازل فرمائیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْيَاكُمْ ج ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً ق ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَاۤءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۶. ۲۹)

بھلا تم اللہ تعالیٰ سے کیوں کر منکر ہو سکتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو دوبارہ جِلائے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے﴿۲۸﴾ وہی ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے نفع کے لیے پیدا کیا، پھر اُس نے آسمان کی جانب توجہ فرمائی یعنی اُن کے مکمل کرنیکا ارادہ کیا سو اُس نے ان کو درست کر کے سات آسمان بنائے اور وہ ہر شے سے باخبر ہے۔﴿۲۹﴾

تفسیر: بھلا تم کیونکر اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور ناسپاسی کرتے ہو؟ حالانکہ تم بالکل بے جان تھے۔ پھر تم کو اس خدا نے زندہ کیا۔ پھر اس زندگی کے بعد وہ تم کو موت دے گا۔ پھر تم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر اسی

کی خدمت میں تم سب کی بازگشت ہوگی۔ وہ قادر مطلق ایسا ہے جس نے زمین کی تمام موجودات تمہارے نفع اور تمہارے فائدے کے لئے پیدا کی۔ پھر اس نے آسمانوں کی تکمیل کی جانب توجہ فرمائی اور ان کو ٹھیک اور درست کیا اور ان کو سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر ایک چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

ان آیتوں کا تعلق رکوع کی ابتدائی آیت کے ساتھ ہے۔ بیچ میں قرآن و رسالت کی دلیل تھی۔ پھر کفار کے معارضہ کا جواب تھا۔ اب پھر اصل مضمون کو شروع کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو اور اس محسن حقیقی کے احسانات و انعامات پر غور کرو کہ تم بالکل بے جان اور مردہ تھے۔

جس مادہ سے تم بنے ہو وہ ابتداءً غذا کی شکل میں تھا۔ جو تمہارے ماں باپ کے جسم میں ہضم و تحلیل کے تمام مدارج طے کرنے کے بعد نطفہ بن گیا، پھر رحمِ مادر میں وہ نطفہ مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا اور بالآخر اُس بے جان کو اللہ تعالیٰ نے زندگی اور جان عطا فرمائی۔ پھر اس زندگی کے بعد موت دے گا۔ موت بھی اُس کا احسان ہے۔ پھر اس موت کے بعد قیامت میں دوبارہ زندگی میسر ہوگی۔ پھر تم اسی پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔ بھلا جس کے اس قدر احسانات تم پر ہیں اس کے ساتھ تم ناسپاسی کیونکر کر سکتے ہو؟

اور جو نافرمان ایسا کرتا ہے اس پر بڑا ہی تعجب ہے۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موت تو زندگی کی ضد ہے پھر دونوں احسان کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اس لئے کہ عالمِ آخرت کی نعمتیں اور وہاں کی زندگی بدون اس موت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا نعمت کا ذریعہ اور سبب بھی نعمت ہے۔ اس کے علاوہ موت کے اور بھی فوائد ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارذل عمر سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ پھر دنیوی زندگی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے اور احسانات کا ذکر فرماتے ہیں کہ صرف زندگی ہی دے کر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ تمہاری بقا کا سامان بھی مہیا کیا۔ تمہارے فائدے کے لئے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں۔ کسی سے بالواسطہ فائدہ حاصل کرتے ہو، کسی سے بلا واسطہ نفع اٹھاتے ہو۔ اور اگر کسی کا فائدہ فی الحال معلوم نہ ہو تو یہ مطلب نہیں کہ اس میں فائدہ نہ ہو۔

قدرت کے ہزارہا وہ منافع جو اس نے اپنی کائنات میں انسان کے لئے رکھے ہیں۔ ان سب کا علم بیک وقت ہونا ضروری نہیں۔ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ جب ہر چیز مفید اور سودمند ہے تو وہ حلال بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ سنکھیا اور دوسری سمیات میں بہت سے فائدے ہیں۔ لیکن اطباء ان کے استعمال سے روکتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نہ کوئی فائدہ تو ہر شے میں ضرور ہے لیکن بعض طبائع کے لئے بعض اشیاء میں ضرر بھی

ہے۔اس لئے نفع اور ضرر کے لحاظ سے حلت وحرمت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر جس طرح زمین کی جملہ اشیاء میں بنی نوع انسان کے لئے منافع مضمر ہیں اسی طرح آسمان سے بھی انسانی مخلوق کے بے شمار فوائد وابستہ ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ زمین وآسمان دونوں ہی سے انسان کی زندگی اور بقا کا تعلق ہے۔اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ پھر اس نے آسمان کی خلقت کو کامل کرنے کی جانب توجہ کی۔ چنانچہ اس کو درست کر کے سات آسمان بنا دیئے اور وہ ہر جاندار کی تمام ضروریات کا پورا عالم ہے۔

آسمان وزمین کے بننے میں ایک مشہور بحث ہے کہ پہلے آسمان بنا، یا زمین۔ یہ بحث چونکہ طویل ہے اس لئے ہم آئندہ کسی موقع پر عرض کریں گے۔ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کی دو قسمیں ہیں جس کو سورۂ لقمان میں ظاہری احسان اور باطنی احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''**واسبغ علیکم نعمه ظاهرة وباطنة**'' یعنی اس نے تم پر اپنی نعمتیں، خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، پوری فرمادی۔ظاہری نعمت اور احسان تو یہی ہے جیسے لباس، مویشی، سکونت کے مکان، زراعت کی زمین، کھانا پینا وغیرہ۔ اور باطنی احسانات سے مراد اس قسم کے احسانات ہیں جیسے علم، بزرگی، آبرو، عزت، معاصرین پر فوقیت، اقتدار، مراتب کی بلندی اور تفوق وغیرہ۔

توحید کی بحث میں اب تک جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ ظاہری تھے۔اب آگے باطنی احسانات کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو علم دیا، خلافت عطا کی، اس کو مسجود ملائک بنایا، تم کو اس کی اولاد ہونے کا شرف عطا کیا۔اسی مناسبت اور ربط کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا پورا قصہ بیان فرماتے ہیں تا کہ ظاہری احسانات کے ساتھ باطنی اور معنوی احسانات بھی فی الجملہ بنی نوع انسان کے سامنے آ جائیں اور وہ دونوں قسم کے احسانات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ جب ان احسانات میں خدا تعالیٰ کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے تو ہم اس کی ذات اور صفات یا اس کی عبادت میں کیوں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائیں۔

درسِ حدیث

حضرت مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ

یہ ذکر ہو رہا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دوائیں بتلائی ہیں اُن میں ایک تو شہد ہے، ایک کلونجی ہے، ایک قُسط بحری ہے یہ جڑی بوٹیوں میں سے ہے اور شہد ہے اور ایک خون کا نکلواتے رہنا ہے اور اِس کے علاوہ بھی باتیں بتلائی ہیں، مثلاً ذات الجنب ،یعنی نمونیہ اِس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوا پسند فرمائی ہے، (شہد اور ورس) اُس کے بارے میں ایسے الفاظ تو نہیں ہیں کہ یہ شفاء ہے بلکہ منجملہ دواؤں کے اس کو پسند فرمایا گیا ہے، اُن کی تعریف فرمائی گئی ہے، ایک شہد اور ایک ورس ۔اب یہ ورس جو ہے اِس کو تو کُسُم کہتے ہیں، اِس سے کپڑا رنگا بھی جاتا ہے، اور اِس کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ زعفران اور یہ ایک ہی چیز ہیں، آب و ہوا کے فرق سے یہ ورس بن جاتی ہے اور کہیں جہاں آب و ہوا اِس کے راس آجائے وہیں یہ بوٹی زعفران بن جاتی ہے ۔اِن دو چیزوں کو استعمال فرمانا نمونیے میں یہ مفید ہے، اور دواؤں کے ساتھ انہیں شامل کر لیا جائے ، اور دوائیں استعمال کی جائیں اُن کے ساتھ کچھ جز یہ بھی ہو جائے ، ورس ہے اور شہد ہے یہ تیل ہے روغنِ زیتون ، یہ پسند فرمایا۔ وہاں قاعدہ یہ تھا کہ وہ جُلاّب لیتے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ اسماء بنت عُمیس ؓ سے پوچھا، حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بہت سمجھدار تھیں بہت ذہین، بہت تیز مزاج تھا، یہ حبشہ ہجرت کر کے گئیں اور بلکہ ایسے ہوا کہ یہ تھیں کشتی میں جس میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے، اشعری حضرات تھے، آنا چاہتے تھے اِدھر مگر ہوا کا رخ ہوا دوسری طرف مغربی جانب تو اِن کی کشتی بجائے اِدھر مشرقی ساحل پر سعودی عرب جہاں ہے وہاں لگنے کی بجائے مغربی ساحل پر جا کے لگی ، تو یہ حبشہ پہنچ گئے ۔ یہ پھر وہاں سے سفر کیا، اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں ہیں ۔تو یہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا گھر میں اندر بیٹھی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ملنے آئیں تھیں کہ اِتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے ، اُنہوں نے پوچھا کہ کون ہے گھر میں؟ بتایا گیا کہ اسماء ہیں، اُنہوں نے کہا اسماء :

أء البحرية هذه، أء الحبشية هذه؟ — یہ وہی ہیں جو سمندر کا اور حبشہ کا سفر کیے ہوئے ہیں یہ حبشی ہیں۔

تو اُنہوں نے کہا کہ ہاں، اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِن کو چھیڑ دیا اور یہ کہا کہ

سبقنا کم بالهجرة — ہم نے تم سے ہجرت میں پہل کی۔

ہجرت خاصہ مشکل کام ہے، سب رشتے داروں کو، دوستوں کو، گھر بار کو، درو دیوار کو سب کو دیکھ کر آدمی رخصت ہو، کہ میں جارہا ہوں بس اب اِدھر آنا ہی نہیں، یہ بہت مشکل کام ہے اور ایسی جگہ جانا جہاں کوئی سرو سامان بھی نہیں نظر آتا ہو، کہ کوئی خوشحالی ہوگی، کوئی سہولت میسر ہوگی سوائے اِس کے کہ عبادت کی آزادی مل گئی۔ اِسی لیے ہجرت فرض کی گئی تھی اور جنھوں نے ہجرت نہیں کی اُن کے بارے میں وعید آئی ہے قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ. — جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں، وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے۔ وہ جواب دیں گے ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے۔

یہ جواب دیں گے وہ۔ ملائکہ جب اُن کی روح کو قبض کرنے آتے ہیں تو اُن سے یہ پوچھتے ہیں کہ:

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا. — کیا اللہ کی زمین میں کشادگی نہیں تھی، واسع نہیں تھی وہاں ہجرت کر کے کیوں نہیں گئے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآئَتْ مَصِيْراً. — کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

بہت سخت الفاظ ہیں یہ۔ ہاں:

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلاً. — البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ۔

واقعتاً جو ضعیف ہیں، مرد ہوں یا عورتیں اُن کے لیے یہ ہے کہ رخصت لے لیں کہ وہ مجبور ہیں آ ہی نہیں سکتے۔ لیکن جو ہجرت کر سکتے تھے اور ذرا کوتاہی کی اور بس اُن کا وہ انجام ہے۔ اب جب ہجرت فرض ہوگئی

تو اہل ہجرت کو ثواب بھی ڈبل ملتا تھا کیونکہ مکہ مکرمہ سے جو لوگ گئے تھے اُن کو دوہرا ثواب ملتا تھا، مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے والے کو، اِس طرح کے آدمی کو اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اپنی نماز کا ثواب، یہاں کی نماز کا مدینہ شریف کا، مسجد نبوی کا اور ایک مسجد الحرام کا، جیسے کہ وہ وہی ہیں کیونکہ وہاں سے نکلنا جو ہوا ہے وہ تو بلا حق کے ہوا ہے۔

الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق جو مظلوم اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے۔

مشرکین مکہ کو کوئی حق نہیں تھا کہ اُنہیں گھر سے نکالیں، وطن سے بے وطن کریں اُنہیں، نکال دیں، جان مال کی حفاظت کی بجائے اُنکو غیر محفوظ بنادیں، نہ اُن کی جان محفوظ ہو، نہ مال محفوظ ہو نہ جائیداد محفوظ ہو، جائیدادیں سلب کرلیں، سب کچھ سلب کرلیا اور ختم، بلکہ انعام مقرر کردیا کہ جو اِن کو کسی بھی حالت میں لے آئے یہاں اُس کو یہ انعام ہوگا۔ تو یہ تو اعلانِ جنگ ہوگیا ایک طرح سے، وہاں جانہیں سکتے اُن سے بات کا کوئی ذریعہ نہیں رہا، نامہ و پیام نہیں رہا کچھ بھی نہیں رہا، تو پھر مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ تم جہاد کر سکتے ہو وہ حفاظت اپنی خود کریں، اِس لیے بدر کے موقعہ پر جہاد ہوا ہے اور جب لڑائی چھڑ جائے تو حفاظت کرنا خود ان کا ذمہ ہے۔ ہمارے ذمے نہیں ہے کہ اُن کے سامان کی ہم حفاظت کریں۔ تو اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِن کو چھیڑ دیا تھا۔

سبقنا كم بالهجرة، فلنحن أحق برسول الله صلى الله عليه وسلم منكم. ہم زیادہ قریب ہیں، حق رکھتے ہیں زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب کا، تمہاری بنسبت،

یہ کہنے لگیں یہ کیا بات کری تم نے؟ یہ تو ہم لوگ تھے بہت دور زمین میں:

بعداء، بغضاء ایسے لوگ جن سے محبت نہیں، مبغوض ہم اُنہیں رکھتے ہیں، ''بعداء'' سرزمین ہے بہت دور یعنی فاصلہ بہت۔

اُس زمین میں تھے اور تم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب۔

يطعم جائعكم ويعظ جاهلكم. تم میں سے جو بھوکا ہوتا ہے اسے کھلاتے اور انجان کو نصیحت فرماتے تھے۔

کسی کو آتا نہیں تھا کہ ہمیں مسئلہ بتا سکتے تھے، ہمیں مسئلہ نہیں آتا تھا اس وجہ سے ہم بے چین رہتے تھے اور کسی کو بھوک لگتی تھی تو تمہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتظام کردیتے تھے ہمارے لیے ایسا وہاں کیا انتظام تھا۔ یہ

باتیں انہوں نے کہیں ۔اور کہنے لگیں کہ نہ میں کھاؤں گی نہ میں پیوں گی جب تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہ کرلوں کہ کیا ایسے ہے واقعی کہ ہمیں جو ہجرت میں دقت ہوئی دیر ہوئی تو ہم پیچھے رہ گئے ثواب میں بھی، باوجود اِس مشکل کے، قسم کھالی کہ نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک یہ پوچھ نہ لوں اور: ''لا أزیــــغ '' ''بالکل کوئی کج بیانی بھی نہیں کروں گی'' جو کہا ہے جو بات ہوئی ہے وہی دھراؤں گی، بڑی خفا ہوگئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو پھر اِنہوں نے بات کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''لیس بأحق بی منکم أو کما قال علیه السلام'' یہ لوگ (جنہوں نے ایک ہجرت کی ہے) تم لوگوں سے (جنہوں نے دو ہجرتیں کی ہیں) زیادہ میرے قریب نہیں ہیں۔

حضرتِ عمر نے جو کہا ہے کہ وہ تم سے زیادہ اِس اعتبار سے میرے قریب اور میرے نزدیک حق والے ہوگئے، کہ تم سے زیادہ نہیں ''لیس بأحق بی منکم أو کما قال علیه السلام'' تو اب یہ بات اِتنی خوشی کی ہوگئی اُن کو حاصل کہ ایک سند مل گئی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کی، تو اِتنی خوش یہ بھی ہوئیں اور جتنے اِن کے ہجرت کے ساتھی تھے سب، سب کے سب گروہ در گروہ آتے تھے اور دہراتے سُنتے تھے اِن سے کہ دوبارہ سُناؤ ساری بات ۔یہ تو اُن کے لیے بہت ہی خوشی کی چیز بن گئی یہ حضرتِ اسماء بنت عمیس ہیں رضی اللہ عنہا اور اب ہیں مکہ مکرمہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں کے دستوروں کا بھی پتہ تھا، رواجوں کا بھی پتہ تھا اِن کا واقعہ یہ آتا ہے ۔اچھا یہ ہی وہ ہیں جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شادی کرلی تھی اور اِنہیں سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے ہیں اور اِنہیں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد میں شادی کرلی تھی تو محمد ابن ابی بکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بیٹے بھی ہوئے۔ بہرحال بہت ذہین، بہت تیز ذہن پایا تھا۔ یہ بتلاتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سے پوچھا کہ تمہیں اگر ضرورت پڑتی ہے مسہل لینے کی تو کس چیز سے مسہل لیتی ''بــم تشـمشین'' کہنے لگی ''بالشبرم'' (شبرم ایک گھاس ہے مگر بہت تیز) جیسے کوئی کہہ دے کہ جمال گھوٹا، ہمارے یہاں جیسے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، ذرا سا بھی کھا لیا جائے تو بس ایک مصیبت آجاتی ہے مریض کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور اُس کو ''سموم قاتلہ'' میں (ختم ہی کردے مریض کو) ایسے زہروں میں شمار کیا جاتا ہے اگرچہ تریاق اُس کے ہیں، تو مجھے ایک بہت نیک آدمی ہیں وہ قصہ اپنا سُناتے تھے کہ میرے پاس ایک آدمی آیا کرتا تھا اور ہماری تھی دکان عطارے کی اور وہ دواؤں کا شوقین تھا تو روز آجاتا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے کوئی دوا دے دیجیے، مطلب ہوتا تھا کوئی خمیرہ، کوئی مزے دار دوا

جو ہوتی تھی وہ کھاتا تھا۔ بڑا تنگ کیا اُس نے تو ایک دن کہتے ہیں کہ میں نے اُسے جمال گھوٹا ملا کے دے دیا، اب وہ جمال گھوٹے کے بعد جو اُسے اسہال آنے شروع ہوئے ہیں تو وہ تو باہر نہیں آنے پاتا تھا کہ پھر ضرورت پڑ جاتی تھی، آخر کو وہ گر گیا زمین پر، اب وہ کہتے ہیں کہ بڑا پریشان کہ میں نے اِسے یہ دے تو دیا ہے یہ بچے گا کیسے؟ اور بات بھی کھلے گی لوگوں میں۔ اُنہوں نے پھر خدا کی طرف سے کوئی، یا سُنی ہوئی ہوگی کوئی بات، بہرحال ذہن میں یہ آئی کہ یہ جو بیل گری ہوتی ہے اِس کا مربہ میں دوں۔ بس وہ کہتے ہیں میں نے وہ اُنہیں کھلایا اور وہ فوراً ٹھیک ہو گئے۔ یہ گویا کہ معلوم ہوا اُن کے علم میں یہ ایک چیز آئی کہ اِس کا تریاق ہے۔ اور بھی کچھ چیزیں ایسی ہوں گی ضرور جو حکیموں کو معلوم ہوں گی، باقی یہ بھی ایک چیز ایسی ہے یہ جو فوری طور پر فائدہ دیتی ہے۔ وہ بچ گیا اور یہ بھی بچ گئے، اِنہوں نے بھی شکر کیا، تو یہ تیز دوا تھی یہ استعمال میں لاتے تھے جب مسہل کی ضرورت ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ سُن کر کہ ''حَارٌ جَارٌ'' یہ تو بہت ایک تو گرم ہے یہ اور ایک یہ کھینچ لیتی ہے۔ اب کھینچ لیتی ہے یعنی اُن اجزاء کو بھی لے جاتی ہے ساتھ کہ جن اجزاء سے انسان کو، جو اجزاء جدا نہ ہونے چاہئیں اُن سے ضعف پیدا ہوتا ہے خاص طور پہ اُن اجزاء کے خارج ہونے سے۔ اسی طرح سے عمر کا لحاظ رکھتے ہیں اطباء جو علاج کرتے تھے فالج کا اور دوسری چیزوں کا منضج، مسہل وغیرہ دیتے تھے تو اُس میں عمر کا لحاظ رکھتے تھے کہ کس عمر میں ''بدلِ مایتحلل'' پیدا ہو سکتا ہے یعنی جو چیز تحلیل ہوئی ہے اُس کا بدل ہو جائے اور کس عمر میں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو چیز تحلیل ہو جائے، جو اجزاء تحلیل ہو جائیں اُس کا بدل نہیں ہوتا بہتر، تمام چیزوں کی رعایت رکھتے ہوئے وہ مسہلوں سے علاج کرتے تھے، اِسے ناپسند فرمایا اور یہ فرمایا کہ نہیں ایسے نہ کرو کسی اور چیز سے۔ تو پھر کہتی ہیں کہ میں نے، مجھے ضرورت پڑی مسہل ہی کی تو میں نے مسہل لیا سَنا سے، سنا کا ذکر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو آپ نے بہت پسند فرمایا اور یہ فرمایا

لو أن شيئا كان فيه شفاء من الموت لكان في السنا. اگر کسی چیز میں موت سے شفاء ہوتی تو سنا میں ہوتی۔

اور سنا مکی یہاں نام سُنتے ہیں، استعمال میں آتا ہے یہ نام، ہاں یہ کچھ دوائیں ہیں ایسی جن کا ذکر معتبر کتابوں میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو پسند فرمایا ہے کوئی آدمی اگر ان ساری چیزوں کا مرکب تیار کر لے جو حدیث میں آئی ہیں کوئی معجون سا ایسا بنا لے تو میرا خیال ہے کہ یہ تو بہت مفید چیز بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق دے اور آخرت میں ساتھ عطا فرمائے۔

✿✿✿✿

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
سرسید احمد خان کی نظر میں

جناب سید محبوب رضوی، دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات پر سرسید نے ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کی اشاعت مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق سرسید نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی کے علم وعمل اور صلاح وتقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غُلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد وافکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کے حامل ہوسکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ ''تصفیۃ العقائد'' کی اس مراسلت سے ہوسکتا ہے جو اُن حضرات کے مابین ہوئی، اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف) کو خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے، میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔''
>
> (تصفیۃ العقائد، ص:۳۰)

متذکرہ مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتویؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ:۔

> ''ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سُنی سُنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سُن سُن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔''
>
> (تصفیۃ العقائد، ص:۶)

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرہ صدر مضمون درج ذیل ہے:۔

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری سے بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رویا اور آئندہ بھی بہتوں کو روویگا، لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم وفضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے، لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب کے کوئی شخص ان کے مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا ہے کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلّی میں تعلیم پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی اُن کے اوضاع واطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

؎ بالائے سرش زہوشمندی
میتافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہلِ فضل وکمال تھے، ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہؒ کے فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی اُن کو خیال تھا انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے، وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں رکھتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال ومغرب میں ہزارہا آدمی اُن کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائلِ خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم

مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ وہ کسی ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ بُرے کام کرتا ہے یا بُری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے بُرا جانتے تھے۔ مسئلہ حُب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دینا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا اُن لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت ظاہر کرتی ہے، ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔''

(نقل بأصلہ از علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ)

مورخہ ۲۴ / اپریل ۱۸۸۰ء ص ۴۶۷، ۴۶۸

(بشکریہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی، ماہ اگست 1946ء)

سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

محمد اورنگ زیب اعوان

قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ایک ممتاز ہستی سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی۔
اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام، پیدائشی وفطری صلاحیتوں اور باکمال استاذ محترم کی شفقت وتوجہ سے وہ مجسم تصویر قاسم بن گئے تھے آپ نے امروہہ میں اپنے استاذ معظم کے معارف، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت اور شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے سلوک کی اشاعت کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور جملہ علوم وفنون کے درس دیئے اور تشنگان علوم کی ایک بڑی جماعت کو سیراب کیا۔
آپ کا مختصر تذکرہ قارئین ''الحامد'' کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

نام ونسب: حضرت محدث امروہیؒ کا اسم گرامی سید احمد حسن اور والد ماجد کا نام اکبر حسین تھا۔ ۱۲۶۷ھ بمطابق 1850ء میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔
محمود احمد عباسی نے ''تذکرۃ الکرام'' میں مشاہیر امروہہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت امروہیؒ سے متعلق لکھا:

''علامہ زمان، افتخار زمانیان، استاذ الاساتذہ، افضل الفضلاء، امام المحدثین، ذہین، فطین، خوش رو، خوش تقریر، صاحب وجاہت وبزرگ عہد تھے۔ شاہ ابوالقاسم بن حضرت شاہ ابّن بدر چشتی کے پوتے پیرا کبر حسین کے بیٹے سید احمد حسن کی ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی''

شجرہ نسب: حضرت مولانا سید احمد حسن امروہیؒ کا شجرۂ نسب حضرت شاہ ابّن تک درج ذیل ہے۔
سید احمد حسن بن سید اکبر حسین بن سید نبی بخش بن سید محمد حسین بن پیر سید محمد حسن بن سید سیف اللہ بن سید ابو المعالی بن سید ابوالمکارم بن سید ابوالقاسم بن حضرت شاہ ابّن رحمہم اللہ۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے ابتدائی، متوسط عربی وفارسی کی تعلیم اپنے وطن کے بلند پایہ علماء مولانا سید

رفاقت علی صاحب، مولانا کریم بخش صاحب اور مولانا سید محمد حسین صاحب سے حاصل کی۔ طب کی کتابیں امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خان کنبوہ سے پڑھیں۔

قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ سے اَخذ فیض: نانوتہ، میرٹھ اور دیوبند میں رہ کر قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے تمام علوم وفنون کی تکمیل کی اور اپنے استاذ محترم کے کمالات علمیہ کا مکمل آئینہ بن کر مسندِ درس پر جلوہ فرما ہوئے۔ شفیق استاذ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو جس طرح شفقت، عزت اور توجہ کے ساتھ سفر وحضر میں پڑھایا اور اولاد سے زیادہ عزیز رکھا، اس کی نظیر اس زمانہ کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔

حضرت نانوتویؒ نے اپنے باکمال تلمیذ کو فراغت علوم دینیہ کے ساتھ ہی تعلیمی تحریک کا رکن بنادیا اور ملت بیضاء کی سرسبزی اور شادابی کے لیے خود جو جدو جہد کر رہے تھے اسی میں ان کو بھی مشغول ومنہمک کر دیا۔ حضرت نانوتویؒ ہمیشہ آپ کو میر صاحب، کہہ کر پکارتے، اہم علمی اشکالات کو اُن کی خاطر حل فرماتے۔ اپنے اس عزیز شاگرد کی خاطر کئی مرتبہ امروہہ تشریف لائے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس تاریخی بستی کو مشرف فرمایا۔ ایک مرتبہ مدرسہ اسلامیہ قائم کرنے کا اہل امروہہ کو مشورہ دیا اور اس طرح سے مدرسہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

دیگر اساتذہ کرام: حضرت نانوتویؒ کے علاوہ آپ کے استاذہ میں (جن سے صرف اجازت حدیث حاصل ہے۔) مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ اور مولانا عبدالقیوم بھوپالیؒ بھی شامل ہیں۔

حضرت امروہی جب حج بیت اللہ کے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ (یاد رہے کہ مولانا احمد علی سہارنپوریؒ، قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ، اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ یہ تینوں شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ کے شاگرد تھے۔)

بیعت: آپ قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علاوہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی بیعت تھے اور حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ کو اجازت وخلافت سے بھی

نوازا تھا۔

خورجہ میں آمد: تمام علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایما پر خورجہ کے مدرسہ میں درس وتدریس کا آغاز کیا۔ اس مدرسہ کو بھی حضرت نانوتویؒ نے ہی قائم فرمایا تھا وہاں پر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ بھی کچھ عرصہ حضرت امروہی کے ساتھ مدرس رہے۔

مدرسہ سنبھل: مدرسہ خورجہ کی مالی حالت کمزور ہو جانے کی وجہ سے حضرت امروہی کو منشی حمید الدین بیجود سنبھلی نے سنبھل بلا لیا اور وہاں مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ منشی صاحب حضرت نانوتویؒ کے مریدوں میں سے تھے اور سفر وحضر کے رفیق بھی رہے۔ اسی تعلق کی بنا پر حضرت امروہی کو مدرسہ سنبھل میں لانے کی کوشش کی۔ حضرت امروہی سنبھل ایک سال سے زیادہ نہیں رہے۔ اہل خورجہ خصوصاً خان عبداللہ خان وغیرہ منت سماجت کر کے پھر خورجہ لے آئے۔

مدرسہ عبدالرّب دہلی: حضرت محدث امروہیؒ خورجہ میں دوسری مرتبہ ایک تقریباً ایک سال رہے۔ وہاں سے آپ مدرسہ عبدالرّب دہلی تشریف لے آئے۔ مدرسہ عبدالرب میں بھی صدر مدرس رہے۔

مدرسہ شاہی مرادآباد: مدرسہ عبدالرب دہلی سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مشورہ سے مرادآباد آ گئے وہاں مولانا سید عالم علی نگینوی ثم مرادآبادیؒ (متوفی ۱۲۹۶ھ موافق 1878ء) کے بعد ضرورت تھی کہ ایک بڑا مدرسہ قائم کیا جائے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا مقولہ مشہور ہے کہ:

''مولانا سید عالم علیؒ کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ ان کا قائمقام ایک بڑا مدرسہ ہی ہوسکتا ہے''

چنانچہ حضرت نانوتویؒ کی ایما پر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ موافق 1879ء میں شاہی مسجد مرادآباد میں ایک دینی ادارہ کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام ''مدرسۃ الغربا'' تجویز ہوا۔ جواب ''مدرسہ شاہی'' کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنے صاحبزادے حافظ محمد احمد کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے حضرت محدث امروہیؒ کے پاس مرادآباد بھیجا۔ جب حضرت امروہی کے طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی تو حافظ محمد احمد صاحب کو دیوبند بلا لیا۔

آپ اس مدرسہ کے پہلے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے۔ پہلے ہی سال ''مدرسۃ الغربا'' میں طلبہ جوق

درجوق آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادارہ دیوبند وسہارنپور کے بعد علوم وفنون کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا۔

شوال ۱۳۰۳ھ موافق جولائی 1886ء تک حضرت امروہیؒ مراد آباد کے مدرسہ میں رہے۔ اس کے بعد وہاں کے بعض ممبران کی باتوں سے ناراض ہوکر استعفاد دے دیا۔

جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ کی نشأۃ ثانیہ: مدرسہ شاہی مراد آباد سے مستعفی ہونے کے بعد اپنے وطن امروہہ تشریف لے آئے اور یہاں مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی نشأۃ ثانیہ کی۔ یہ مدرسہ بنیادی حیثیت سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا قائم کردہ ہے۔ ازسرنو اس کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اس میں تمام علوم وفنون کی تعلیم جاری کی، پہلے ہی سال اس مدرسہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کچھ ذی استعداد طلباء مراد آباد ہی سے آپ کے ہمراہ آئے تھے۔ اس کے بعد مستقبل قریب میں ہی تشنگان علوم نبویہ شدّ رحال کر کے ہندوستان کے علاوہ کابل، تاشقند، سمرقند اور بخارا سے امروہہ آ کر اس چشمہ فیض سے سیراب ہوئے اور اپنی علمی تشنگی کو دور کیا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ بھی مدرسہ دیوبند میں داخلہ لینے والے بعض طلبہ سے یہ فرمادیتے تھے کہ ''تم میر احمد حسن امروہی کے پاس امروہہ جاؤ وہاں تمہیں تشفی بخش جواب ملیں گے۔''

حضرت حاجی صاحبؒ کا پیغام حضرت امروہیؒ کے نام: حاجی محبوب خان امروہی جب حج بیت اللہ کے لیے جانے لگے حضرت مولانا امروہیؒ نے فرمایا کہ:

> ''حضرت حاجی صاحب سے میرا سلام عرض کر دینا اور یہ کہہ دینا کہ دل حاضری کو بہت چاہتا ہے لیکن کارہائے مدرسہ فرصت نہیں دیتے''

حاجی محبوب خان صاحب نے مکہ معظّمہ پہنچ کر حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ان کے ایک مخلص مرید وخلیفہ کا یہ سلام وکلام پیش کردیا۔ اس کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ:

> ''ہماری یہ ٹوپی ان کو دے دینا اور یہ کہنا کہ جو کام تم امروہہ میں رہ کر انجام دے رہے ہو وہ یہاں کی حاضری سے بہتر ہے''

دار العلوم دیو بند میں تقرر: قیام مدرسہ امروہہ کے چند سال بعد 1900ء میں دار العلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ نے حضرت محدث امروہی کو دار العلوم دیو بند بلا لیا۔حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ اور آپ کی علمی سطح برابر مانی گئی۔البتہ حضرت امروہی کی تنخواہ قدرے زیادہ رکھی گئی۔لیکن وہ وہاں پر دو ماہ سے زیادہ نہیں رہے۔

مدرسہ امروہہ واپسی: حضرت مولانا امروہیؒ کو ابھی دیو بند میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مدرسہ امروہہ کے مہتمم مولوی نادر شاہ خان صاحب دیو بند تشریف لائے۔بعض اشخاص کے دریافت کرنے پر فرمایا:

''ایک باغ ہم نے لگایا تھا جب وہ بار آور ہوا تو اس کا باغبان چلا گیا، وہ باغ خراب ہو چلا''

مولانا قمر الدین فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ بات فرمائی تو ہم سمجھ گئے کہ یہ حضرت امروہی کو لینے آئے ہیں۔

مولوی نادر شاہ خان صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم (ممبر مجلس شوریٰ دار العلوم دیو بند) سے بھی ملنے گئے اور ان کو بتلایا کہ ہمارا باغ اجڑنے کا اندیشہ ہے۔حکیم مشتاق احمد صاحب نے فرمایا:

''خان صاحب آپ پریشان نہ ہوں آپ کے باغ کا خیال رکھا جائے گا''

باقی ممبران شوریٰ سے بھی مشورہ ہوا اور یہی طے پایا کہ مدرسہ امروہہ کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے اس لیے حضرت مولانا امروہی کو امروہہ واپس بھیج دیا جائے۔یوں حضرت امروہیؒ دوبارہ اپنے مدرسہ میں تشریف لے آئے۔

مدرسہ امروہہ کے انتظامی امور پر ناراضگی: مدرسہ کے منتظمین خصوصا مولوی نادر شاہ خان صاحب مہتمم، مدرسہ کے انتظام کے سلسلہ میں کچھ کام کر رہے تھے جو حضرت امروہیؒ کے نزدیک شرعاً درست نہیں تھا۔منع کرنے کے باوجود وہ اس کام سے رک نہیں رہے تھے اور اسی وجہ سے آپ ناراض ہو کر مراد آباد تشریف لے گئے۔

مدرسہ امروہہ کے اہل شوریٰ منت سماجت کر کے واپس لے آئے اور مولوی نادر شاہ خان صاحب کو ان کی ذمہ داری سے سبکدوش کر کے شیخ عبد الکریم وکیل مرحوم کو مہتمم مدرسہ مقرر کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کی رُکنیت: مولانا محمد منیر نانوتویؒ کے بعد مولانا حافظ محمد احمد صاحب دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم ہوئے۔ دارالعلوم کے سرپرست ہی نہیں بلکہ تمام علماء کے سُرخیل قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے مشورہ کے بعد مولانا امروہیؒ کو مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا گیا۔ آپ کی مدت رکنیت ۱۳۱۳ھ سے ۱۳۲۹ھ تک ہے۔

ردّ قادیانیت: یہ بات علمی حلقوں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت، مسیحیت اور مہدویت کی تصدیق کرنے والوں میں امروہہ کے مولوی محمد احسن اور بھیرہ کے حکیم نورالدین نمایاں مقام رکھتے تھے۔

مولوی محمد احسن امروہی کے متعلق محمود احمد عباسی اپنی کتاب ''تذکرۃ الکرام'' میں لکھتے ہیں:

''(انہوں نے) آخری حصہ (عمر) میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ مسیحیت و مہدویت کی تصدیق کی اور جماعت احمدیہ میں داخل ہوکر احمدی مشرب کی تبلیغ کرتے رہے''۔

آخر میں لکھتے ہیں:

''(ان کو) قادیانی مشن کی جانب سے گھر بیٹھے تنخواہ برابر ملتی رہی''

جب قادیانیت کے اثرات حضرت محدث امروہیؒ کے وطن میں پہنچے اور محمد احسن قادیانی نے اپنے محلّہ کے چند افراد کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا۔ حکیم آل محمد (جو قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے بیعت تھے) وہ بھی اس فریب میں آگئے۔ مولانا سید بدرالحسن جو کہ حضرت محدث امروہیؒ کے شاگرد تھے انہوں نے بھی محمد احسن امروہی کی ہمنوائی شروع کردی۔

ایسے وقت میں جس طرح ان کے استاذ معظم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی اسلامی رگِ حمیت جوش میں آجایا کرتی تھی انہوں نے بھی نتائج و مآل کار کو سامنے رکھ بغیر بے چینی کے ساتھ فتنہ قادیانیت کے اثرات سے اُمت مسلمہ کو بچانے کے لیے انتہائی کوشش کی اور ہر محاذ پر تحفظ ختم نبوت کا جہاد شروع کردیا۔ علماء شہر نے محمد احسن قادیانی سے مناظرہ کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ احمد حسن میرے مقابلہ پر آوے۔

حضرت محدث امروہیؒ نے قادیانیت کے خلاف تقریریں کیں، تحریریں لکھیں، مناظرہ کرایا، اور مباہلے پر تیار ہوئے۔

مولانا سید بدرالحسن کا قادیانیت سے تائب ہونا: مولانا سید بدرالحسن صاحب امروہی، حضرت محدث امروہیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ان کی آمدورفت محمداحسن کے پاس ہوگئی۔اس کی باتیں سن کر حیات مسیح علیہ السلام میں شک وتردد ہوگیا تھا۔اہل علم اور دوستوں نے ہرچند ان کو سمجھایا لیکن ان پر باطل کا اثر ہوچکا اس لیے کسی کی نہ سنتے تھے۔بلکہ اُلٹا مناظرہ کرتے تھے۔

حضرت محدث امروہیؒ کو ان واقعات کی اطلاع ہوچکی تھی۔ایک دن ان کو حضرت کے پاس لایا گیا۔حضرت نے ان کو دیکھ کر فرمایا:

''مولوی بدرالحسن! حقیقت میں تم ہمارے طبیب روحانی ہو۔ہمیں یہ غرور ہوچلا تھا کہ ہمارا شاگرد اور ہمارے پاس بیٹھنے والا باطل میں گرفتار نہیں ہوسکتا۔اب معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے۔تم نے ہمارے غرور کی اصلاح کردی''

نہ معلوم کس جذبہ سے یہ الفاظ حضرت محدث امروہیؒ نے فرمائے تھے کہ مولانا بدرالحسن صاحب زاروزار رونے لگے،قدموں پر گر گئے اور اس فاسد عقیدے سے توبہ کی۔

حضرت محدث امروہیؒ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو دعوت مناظرہ ومباہلہ بھی دی۔جو کہ درج ذیل ہے:

> ''بسم اللہ! آپ تشریف لائیے میں آپ کا مخالف ہوں۔آپ مسیح موعود نہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔آپ اپنے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔میں بنام خدا مستعد ہوں خواہ مناظرہ کیجئے یا مباہلہ۔آپ اپنے اس دعویٰ کا احادیث صحیحہ معتبرہ اور قرآن پاک سے ثبوت دیجئے اور میں انشاء اللہ تعالیٰ اس دعویٰ کی قرآن واحادیث صحیحہ سے تردید کروں گا۔''

حضرت محدث امروہیؒ عقیدہ اہل سنت والجماعت کی حقانیت کا ایک مجسم اور زندہ ثبوت تھے۔مرزا غلام احمد قادیانی نے حضرت مولانا امروہیؒ کے متعلق کیا کیا پیشن گوئیاں نہیں کیں اور مباہلہ کے چیلنج کو اپنی افتادِ طبع کے مطابق کڑواہٹ اور سختی کے ساتھ قبول کیا۔دنیا جانتی ہے کہ مرزا قادیانی 1908ء میں ختم ہوا اور حضرت محدث امروہیؒ 1912ء میں عالم آخرت کو سدھارے۔

عادات واخلاق: حضرت محدث امروہیؒ کو اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا۔اخلاق حسنہ کا

مجموعہ تھے ہاں دین کی حمایت میں غصہ وجلال نمودار ہو جاتا تھا۔تواضع ،مہمان نوازی، شفقت علی الخلق اور صلہ رحمی میں اپنی مثال آپ تھے۔

علم کا وقار اور دین کی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے خودداری کے ساتھ رہتے تھے۔پوری عمر درس وتدریس، وعظ ونصیحت ،امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں گزاردی۔اپنے شاگردوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔عوام الناس سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے تھے۔شہر میں وعظ کے لیے جب کوئی بلاتا تھا تو بلاتکلف اُن کے ہاں پہنچ کر وعظ فرماتے۔شادی، غمی کے رسم ورواج اور بدعات کی روک تھام کرتے تھے۔شاگردوں، مریدوں اور خدام کے حالات کی خبر گیری رکھتے تھے۔زندہ اہلِ ذکر اور صاحب حال بزرگوں سے اچھے روابط تھے۔

حُلیہ: میانہ قد ، دوہرا جسم ،خوبصورت وحسین چہرہ ، داڑھی پر عمر کے آخری حصے میں وسمہ ومہندی کا خضاب لگاتے تھے۔آپ کا حسن وجمال مشہور تھا۔دینی عظمت وشوکت کے ساتھ ساتھ سراپا حسن اور مجسم محبوبیت تھے۔

مرض اور وفات: ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کے آخری حصہ میں چند روز شدید بخار رہا۔اس سال طاعون کی وبا شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔بالآخر اسی میں مبتلا ہو کر ۲۸۔۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بعد نماز عشاء گیارہ بجے شب آپ کا وصال ہوا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

۲۹ ربیع الاول موافق 19 مارچ 1912ء بروز منگل صحن جامعہ مسجد امروہہ کے جنوبی گوشے میں تدفین ہوئی۔ حضرت امروہیؒ کے آخری کلمات ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' تھے۔نماز جنازہ استادزادہ حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ نے پڑھائی۔

اکابر دیوبند کے آپ کی وفات پر تاثرات

☆ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے فرمایا:

''ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کا آخری دن بھی مسلمانوں کے لیے نہایت پرآشوب تھا کہ جب ان میں سے حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہی قدس سرہٗ اٹھالیے گئے۔مولانا کا وجود خدا تعالیٰ کی رحمت تھی۔آپ کی ذات

سے اہلِ اسلام کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اہلِ اسلام آپ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ کر لیتے تھے۔''

☆ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نہایت محبوب شاگرد تھے۔ تبحر علمی میں حجۃ الاسلام کے صحیح جانشین مانے جاتے تھے، سیاسی خیالات میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے رفیق تھے۔''

☆ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ رقم طراز ہیں:

''ہر شخص جس کو کچھ بھی تجربہ ہو جانتا ہے کہ دنیا میں بہت کم علماء ایسے ہوتے ہیں جن کو علمی شعبوں کی ہر ایک شاخ میں پوری دستگاہ ہو۔ مثلاً جن حضرات کو وعظ کہنے میں ملکہ ہوتا ہے وہ تدریس پر پورے قادر نہیں ہوتے اور جو تدریس کے کام میں مشغول ہوتے ہیں ان کو کسی مجمع میں وعظ یا تقریر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دینیات میں انہماک رکھنے والے اکثر معقول و فلسفہ سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اور معقولات کے ماہرین کو علوم دینیہ سے بے خبری ہوتی ہے۔ لیکن قدرت نے اپنی فیاضی سے ہمارے مولانا ممدوح (محدث امروہیؒ) میں یہ سب اوصاف اعلیٰ طور پر جمع کر دیئے تھے۔

مولانا کی تقریر، تحریر، ذہانت، تبحر، اخلاق اور علوم عقلیہ نقلیہ میں کامل دستگاہ ضرب المثل تھی۔ اور سب سے زیادہ قابلِ قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والمعارف کے دقیق و غامض علوم کو انہی کے لب و لہجہ اور طرز ادا میں نہایت صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔

آخر میں ہم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا مرثیہ کہ جس کا ہر ہر لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے قارئین ''الحامد'' کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

فریادِ مہجوراں

گم ہوئی ہے آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے
حضرتِ قاسم نشانی دے گئے تھے اپنی جو

سید العلماء امام اہل عقل واہل نقل
پاک صورت ، پاک سیرت ، صاحبِ خُلقِ نکو

معدنِ علم وحکم سرِ دفترِ اہلِ کمال
عازمِ خلدبریں ہے جس کو چلنا ہے چلو

جب شبیہہ قاسمی سے بھی ہوئے محروم ہم
تم ہی بتلا دو کہ پھرہم کیا کریں اے دوستو

درد یہ پہنچتا ہے سب کو اس کا منکرکون ہے
ہاں مگر اک فرق ہے تھوڑا ساگر میرے سُنو

لوگ کہتے ہیں چلے علامۂ احمد حسن
اور میں کہتا ہوں وفات قاسمی ہے ہو نہو

کاملِ واکمل سبھی موجودہیں پراس کو کیا
جو کہ مشتاقِ ادائے قاسم خیرات ہو

اپنی اپنی جائے پر قائم ہیں سب اہلِ کمال
پر جگہ استاد کی خالی پڑی ہے دیکھ لو

ہاں جنونِ اتحادِ قاسمی میں بارہا
تم کو ہم کہتے تھے من اور آپ کو کہتے تھے تو

مجمعٔ حسرت قرین دردوغم میں میں بھی تھا
فکر میں تاریخ کے سب کیا جب سرفرو

بادلِ پُریاس آئی کان میں میرے صدا
حک ہوئی تصویرِ قاسم صفحۂ دنیاسے لو

۱۳۳۰ھ

نوٹ: اس مضمون کے لیے مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہی کی تصنیف ''سیدالعلماء'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

✿✿✿✿

قسط نمبر ۲

علمائے ہند کا سیاسی موقف

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادیؒ

انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد علمائے کرام نے ملک کے حالات کا جائزہ دیدہ وری اور وسعتِ قلب ونظر کے ساتھ لیا تو اُنہیں یہ بات صاف طور پر محسوس ہوئی کہ'' مسلمانوں کی شامت اعمال نے انگریزوں کے روپ میں ان پر ایک نادر مسلط کر دیا ہے'' قرآن کے اعلان کے مطابق مسلمانوں کو ''قوامون بالقسط'' یعنی دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنے والے ہونا چاہیے کہ وہ ظلم وجور سے اپنے آپ کو بچائیں اور اپنے ساتھیوں، پڑوسیوں اور دوسرے انسانوں کو بھی بچائیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ مسلمان پہلے سچے اور پکے مسلمان ہوں، علماء نے محسوس کیا کہ یہ سب مصیبتیں مسلمانوں پر اوران کے واسطہ سے پورے ملک پر اس لیے آئی ہیں کہ مسلمان صرف نام کے مسلمان رہ گئے ورنہ ان کے فکر ونظر میں، اعمال و افعال میں اور اخلاق وکردار میں کوئی بات ایسی نہیں جس کہ وجہ سے یہ کہا جاسکے کہ یہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کسی بہترین نظام زندگی کے حامل ہیں۔اس بناء پر علماء نے انحطاط وزوال کے اصل سبب کا کھوج لگا کر اپنی تمام کوششیں اس پر مرکوز کر دیں کہ مسلمانوں کو مسلمان بنایا جائے اور انہیں صحیح اسلامی فکر وذہنیت کی تخم ریزی کر کے اس قابل بنایا جائے کہ وہ پھر منصب ''قوامون بالقسط'' کو حاصل کر سکیں۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دار العلومیہ: علماء نہ سرسید کی طرح ملک کے سفید فام آقاؤں کی تلوار سے خوف زدہ ہوئے اور نہ اِن کو ہندوؤں کی عددی اکثریت نے اس پر مجبور کیا کہ وہ اس زد سے بچنے کے لیے حکومت وقت کے دامانِ کرم میں پناہ ڈھونڈتے۔ انہوں نے کمال خود اعتمادی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ مسلمانوں کی ذہنی اور دماغی تربیت کا کام شروع کر دیا اور اس مقصد کے لیے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا تلوار سے مقابلہ کیا تھا اپنے چند رفقاء کے ساتھ دار العلوم کے نام سے ۱۲۸۳ھ میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا۔

علماء اور علوم جدیدہ: علماء کی نسبت عام اعتراض ہے کہ وہ وقت کے مصالح کا بالکل لحاظ نہیں کرتے اور اپنی خشک مذہبیت کی دیواری سے باہر نکل کر یہ دیکھتے ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسی سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ جب سر سید نے مسلمانوں میں انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی اشاعت کرنی چاہی تو علماء نے مخالفت کی اور مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے باز رکھنے کی نامستحسن کوشش کی، ممکن ہے کسی ایک عالم یا علماء کی کسی ایک جماعت کی نسبت یہ خیال صحیح ہو۔ لیکن جہاں تک مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کا تعلق ہے یہ اعتراض قطعاً بے بنیاد ہے۔ مولانا نانوتوی کو سر سید سے جو اختلاف تھا وہ ان کے فساد عقائد کی وجہ سے تھا اور اس بناء پر تھا کہ وہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں ایک غلامانہ فکر، انگریزوں کی نقالی کا جذبہ اور دین سے بے اعتنائی کا میلان پیدا کر رہے تھے۔ ہر ایک سلیم الفکر مسلمان کی طرح مولانا اس کا یقین رکھتے تھے کہ سر سید کی روش مسلمانوں کے ذہن کے لیے دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے زہر ہلاہل ثابت ہوگی چنانچہ مولانا اپنے ایک ارادتمند پیر جی محمد عارف صاحب کو جو مولانا اور سر سید میں خط و کتابت کا وسیلہ تھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس وقت کی عرض و معروض کا ماحصل فقط اتنا ہی تھا کہ سید صاحب (سر سید) کی ہاں میں ہاں ملانا ہم سے جبھی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو ان کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے''۔

(تصفیۃ العقائد، ص:۵)

مولانا سر سید کی دردمندی اہل اسلام کے بھی معترف تھے، اسی مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:

> ''پیر جی صاحب! یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں اُلجھتا اور اُلجھے بھی تو کیوں کر اُلجھے، وہ کون سی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو، ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل کو چھوڑ کر اس نفسانفسی میں پھنسوں، ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی

نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ فساد و عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ ہوں''۔

(تصفیۃ العقائد، ص:۶)

سر سید تو پھر بھی مسلمان تھے اور مسلمانوں کا درد رکھتے تھے۔ علماء تو اس رحمتِ عالم پیغمبر ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہیں جس نے دشمنوں سے پتھر کھا کے بھی ان کے حق میں دعاء خیر کی ہے، اس بناء پر مولانا ذاتی طور پر سر سید سے کیونکر عناد رکھ سکتے تھے۔ اختلاف صرف ان کی غلط پالیسی اور غلط طریقِ کار سے تھا جو بے شبہ انگریزوں کی سیاست کا شکار ہو جانے کا نتیجہ تھا۔

سر سید کے ذاتی احترام و ادب اور ان کے ساتھ محبت کے علاوہ سر سید مسلمانوں کو جن علوم جدیدہ کی دعوت دے رہے تھے مولانا کو اس سے بھی اختلاف نہیں بلکہ وہ ان کے حامی اور موید تھے البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلمان علوم جدیدہ اس وقت سیکھیں اور پڑھیں جب ان کی ذہنی اور دماغی تربیت اسلامی طرز فکر (Ideology) کے مطابق ہو چکی ہو ورنہ اندیشہ تھا (اور یہ اندیشہ بعد میں ایک نہایت تلخ حقیقت بن کر جلد ہی سامنے بھی آ گیا) کہ مسلمان گمراہ ہو کر اپنے دین اور دنیا دونوں کو برباد کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ قیام دارالعلوم کے آٹھ سال بعد پہلے جلسۂ تقسیم اسناد و دستار بندی کے موقع پر مولانا نے جو تقریر کی تھی اس میں صاف صاف علوم جدیدہ کی حمایت، مگر ان کی تحصیل کی شرط پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہو گی کاش گورنمنٹ ہند بھی طلباء کے لیے داخلہ کی قید عمر کو اڑا دے، تاکہ رفاہِ عام رہے اور سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد کسے کہتے ہیں۔''

(القاسم کا دارالعلوم نمبر، ص:۶۷)

مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ کو جو شامل نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ انگریزی تعلیم کے سرکاری مدارس جگہ جگہ قائم تھے۔ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کسمپرسی کے عالم میں تھے تو یہی اسلامی علوم و فنون تھے جن کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا اسی خطبہ میں ایک موقع پر فرماتے ہیں:

اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطینِ زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علوم جدیدہ بنانا تحصیل حاصل نظر آیا''۔

علاوہ بریں مولانا یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ علوم قدیمہ میں استعداد بہم پہنچانے کے بعد ایک طالب علم کا دماغ علوم وفنون سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی تحصیل بڑی آسانی سے اور دوسرے بے استعداد طلباء کے مقابلے میں زیادہ عمدگی اور خوبی وپختگی کے ساتھ کرسکتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''اور انشاء اللہ یہاں کے (دارالعلوم دیوبند) طالب علم بشرط تکمیل باقی علوم قدیمہ اور جدیدہ کو بوجہ قوت استعداد بسہولت بہت جلد حاصل کرسکتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے۔ فقط علوم دینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے.................اس لیے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم وفنون جدیدہ سے کامیاب نہ ہوئے ہوں پر ان کے حق میں ان کی استعداد مثل استاد کامل تعلیم کے لیے کافی ہوگی''۔

(القاسم کا دارالعلوم نمبر محرم الحرام ۷؁ھ)

ان اقتباسات سے یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقائے کرام جو بے شبہ اپنے زمانہ کے کبار علماء اور اساطین دیانت وتقویٰ تھے نہ انگریزی زبان سے بیر رکھتے تھے[1]۔ نہ علوم

---

[1] یہاں اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا نانوتوی حج کے لیے جاتے ہوئے ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے کہ جہاز کے انگریز کپتان نے مولانا کو اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگا۔

''مولانا! آپ کی نماز کا انداز ہی اور کچھ ہوتا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بھی نماز پڑھتے دیکھا ہے مگر وہ تو اس طرح نہیں پڑھتے''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی اور خدا کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے مسلمان کسی اور خدا کے لیے۔ مولانا انگریز کی......

جدیدہ سے نفور تھے اور نہ اتنے تنگ نظر اور متعصب تھے کہ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی خبر ہی نہ ہو سرسید کی طرح ملک کے نئے حالات، اور ان حالات کے نئے مطالبات کا ان کو بھی پورا علم تھا اور وہ انہیں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کی سوسائٹی کی تعمیر ایک ایسے طریقہ پر کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان پکے اور سچے مسلمان بھی بن جائیں اور اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ انگریز کی اس غلامی سے بھی نجات پا جائیں جو بلائے بے درماں کی طرح ان پر مسلط ہوگئی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے اس ابتدائی دور میں سب سے زیادہ چرچا درس و تدریس مذہبی مباحثہ ومناظرہ اور روحانی افادہ وافاضہ کا سنا جاتا ہے اور سیاسی سرگرمی بہ ظاہر مفقود نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا۔ دارالعلوم کا یہ دور تعلیم و تربیت اور ذہنی و دماغی تثقیف کا دور ہے یہ ظاہر ہے کہ ملٹری ٹریننگ پانے والے ٹریننگ ختم ہونے سے پہلے جنگ پر نہیں بھیجے جاتے جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی پرسکون وخاموش تربیت کا نتیجہ تحریک حضرت سید احمد شہید کی صورت میں انیسویں صدی میں ظاہر ہوا تھا ٹھیک اسی طرح مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی اور دوسرے اکابر کی تعلیم و تربیت (بواسطہ دارالعلوم) کا عملی و سیاسی اثر بیسویں صدی کے آغاز میں تحریک حضرت شیخ الہند اور بعد میں جمعیۃ العلماء کی صورت میں ظاہر ہوا یہی وجہ ہے کہ اگرچہ علمائے دیوبند نے اس وقت سیاسیات میں عملی حصہ نہیں لیا لیکن ان کا دماغ سیاسی فکر سے خالی نہیں تھا حکومت کی بار بار کوششوں کے باوجود مدرسہ کے لیے سرکاری امداد قبول نہ کرنا گورنمنٹ کے ساتھ کوئی تعلق پیدا نہ کرنا۔ حضرت مولانا نانوتوی کی وصیت کے مطابق جواب بھی دارالعلوم کے خزانہ میں محفوظ ہے دارالعلوم کا خرچ زیادہ تر عام مسلمانوں کے چندہ سے ہی چلانا اور اس کے لیے امراء ورؤسا کے پاس نہ جانا، یہ سب کچھ علماء کی گوشہ نشینی اور عزلت پسندی کی وجہ سے نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اس طرز عمل کی بنیاد اس تخیل پر تھی کہ گورنمنٹ سے مالی مدد لینے کے بعد ان کی تعلیم بالکل آزاد نہیں رہ سکتی اور یہ حضرات چاہتے تھے آزاد تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی نسل پیدا کرنا جس کا دماغ اور ذہن سرکاری مدد کا کسی درجہ میں ممنون نہ ہو اور جو ہمہ جہت آزاد فکر کے ساتھ علم وعمل کی زندگی بھی بسر کر سکے۔

.... یہ بات سن کر جذبہ سے بیقرار ہوگئے سمجھانے کی کوشش کی مگر زبان کی مغائرت کی وجہ سے سمجھا نہ سکے اور بڑی حسرت سے فرمایا اے کاش میں انگریزی زبان میں تقریر کرسکتا۔

دارالعلوم دیوبند کی اس خاموش و پرسکون تعلیم و تربیت نے سیاسی اعتبار سے علماء میں کس قسم کی ذہنیت پیدا کی اور اُنہوں نے اس میدان میں کیا کیا اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دیوبند کی داستان کو یہاں پر ناتمام چھوڑ کر ہند کے ایک دوسرے طبقۂ علماء کا ذکر کیا جائے[1]۔

مولانا شبلی نعمانی اور ندوۃ العلماء: علمائے ہند کا ایک دوسرا مرکزی ادارہ ندوۃ العلماء ہے جس کے روح رواں ملک کے نامور محقق و فاضل مولانا شبلی نعمانی تھے مولانا سرسید کے معاصر، مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ان کے دست راست اور رفیق کار تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علی گڑھ کی فضا میں علم و ادب او راسلامی و تاریخی لٹریچر کا مذاق پیدا کرنے میں مولانا کی علمیت و قابلیت اور ان کی کوششوں کا بہت بڑا دخل ہے جب تک سرسید علی گڑھ کے مشہور پرنسپل مسٹر بیک کے زیر اثر آ کر سیاسی اعتبار سے ''مرتد'' نہیں ہوئے تھے مولانا علی گڑھ میں اطمینان سے کام کرتے رہے لیکن جب سرسید نے مختلف پارٹیوں کے نام سے اور انفرادی طور پر بھی مسلمانوں کی غلط سیاسی رہنمائی شروع کی تو مولانا کے لیے اس کو برداشت کرنا ناممکن ہوگیا دونوں میں آئے دن ان بن رہنے لگی اسٹیج اور اخبارات کے صفحات پر بھی اس کا اظہار ہونے لگا مولانا طبقۂ علماء سے تعلق رکھنے اور قدیم تعلیم یافتہ گروہ کے ایک قابل فخر فرزند ہونے کی وجہ سے نہ سیاست افرنگ کے ہمرنگ زمیں دام میں اسیر ہوسکے اور نہ سرسید کی ہمہ گیر شخصیت کا ان پر جادو چل سکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی زندگی تک جوں توں کر کے شیوۂ ارباب وفاء نباہتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ہی علی گڑھ کو خیر آباد کہہ کر ندوۃ العلماء کو سنبھال کر بیٹھ گئے مولانا کو سرسید سے جن امور میں اختلاف تھا مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو خوب منقح اور واضح کر کے حیات شبلی میں بیان کیا ہے اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ جو مذہبی، سیاسی اور معاشرتی امور علماء دیوبند اور سرسید گروپ میں اختلاف کا باعث تھے وہ ہی سرسید اور مولانا شبلی کے باہمی مناقشہ ومخالفت کا سبب تھے یہاں ہم مولانا شبلی کے سیاسی افکار بیان کریں گے تا کہ یہ ظاہر ہوسکے کہ قدیم تعلیم کا کوئی ایک فرد علی گڑھ کی فضا میں رہتے ہوئے بھی انگریزوں کی سیاست سے غیر متاثر رہ کر ملکی سیاسیات میں کس نقطۂ

---

[1] ہم نے گزشتہ صفحات میں دیوبند اور علی گڑھ کا موازنہ کیا ہے لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ دیوبند اور علی گڑھ سے مراد صرف انہیں دونوں تعلیمی اداروں کے حضرات ہیں بلکہ دیوبند سے مراد قدیم تعلیم یافتہ گروہ ہے اور علی گڑھ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ! خواہ ان طبقوں کے افراد تعلیمی اعتبار سے ان اداروں سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

نظر وطرز فکر کا حامل ہوتا تھا۔

مولانا نے اب سے کم وبیش نصف صدی قبل مسلمانوں کی فرقہ پرورانہ سیاست اوراسی ذیل میں مسلم لیگ اور دوسری حکومت پرست جماعتوں کی مذمت وہجو،اوراس کے بالمقابل کانگریس کی حمایت، ہندو و مسلم اتحاد کی ضرورت واہمیت اور ہندوستانی قومیت وغیرہ پر نثر اور نظم میں نہایت جوش وخروش سے جو مقالات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ایک نیشلسٹ اور قوم پرور مسلمان بھی ان مسائل سے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہے جتنا کہ مولانا کہہ گذرے ہیں سرسید گروپ کی فرقہ ورانہ سیاست کے بالمقابل مولانا شبلی کی یہ گرج ہماری سیاست قبل از جنگ عظیم اوّل کی کتاب کا ایک نہایت روشن اوراہم باب ہے اس لیے ہم ذیل میں مولانا کے افکار خود ان کے الفاظ میں جستہ جستہ پیش کرتے ہیں۔

انگریزوں سے خوف زدگی کی مذمت: سرسید نے مسلمانوں کو انگریزوں سے جو حددرجہ خوف زدہ کردیا تھا مولانا اس کی نسبت لکھتے ہیں:

> ''ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی۔اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں..................اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن بزدلی چھا گئی۔ ہمارے پولٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑا کہ تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لیے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے''۔[1]

[1] مولانا کے سیاسی مضامین جو الندوہ اور مسلم گزٹ وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے مقالات شبلی کی جلد ہشتم میں یکجا کردیئے گئے ہیں اس سلسلہ کے سب اقتباسات اسی مجموعہ کے مختلف مضامین سے ماخوذ ہیں۔

سرسید کے سیاسی ارتداد کا ماتم: مسٹر بیک کے زیر اثر سرسید کی جو قلب ماہیت پیدا ہوگئی تھی مولانا نے اس کا نہایت پر درد مرثیہ لکھا۔ فرماتے ہیں:

''اس عجیب اور حیرت انگیز اختلافِ حالت کا سمجھنا آسان نہیں یہ حالت قدرتی اور اصلی نہ تھی بلکہ پر زور رکاوٹوں نے پیدا کی تھی وہ پر زور دست وقلم جس نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈلٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تینوں آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پر زور لٹریچر پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ جاں باز جو آگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہوکر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہیں تھیں............حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا۔ یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کردیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے''۔

مسلم لیگ کی حقیقت: مسلم لیگ کا مذاق کس انداز میں اڑاتے ہیں؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اُنیسویں صدی کے آغاز میں نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء میں اس کے سب آغاز وانجام دیکھ کر اس کی نسبت اپنی رائے ظاہر کررہے ہیں فرماتے ہیں:

''اس موقع پر پہنچ کر دفعتہً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے۔ ''مسلم لیگ'' یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ انٹی کانگریس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے''۔

مسلم لیگ کی سیاست کا مرتبہ مولانا کی نظر میں کیا تھا! سطور ذیل سے اندازہ ہوگا!

''ہم پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم ''لیگ'' پر اعتراض کرتے ہیں لیکن خود نہیں

بتاتے کہ صحیح پالیٹکس کیا ہے؟ اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے۔ یہی صحیح پالیٹکس ہے غلط پالیٹکس کے جراثیم قوم کے دل و دماغ میں سرایت کر گئے ہیں اور یہی جراثیم صحیح پالیٹکس کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے''۔

مسلم لیگ کا اصل مقصد: مسلم لیگ کا کارنامہ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے کہ اس نے ہندو و مسلمانوں میں منافرت پیدا کر کے دونوں کو لڑا یا مولانا کی نگاہ ژرف بیں نے اس حقیقت کو شروع ہی میں تاڑ لیا تھا۔ دیکھئے کس جزم و یقین سے لکھتے ہیں:

''آج مسلم لیگ گو شرم مٹانے کے لیے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اس کے چہرہ کا مستعار غازہ ہے۔ رات دن جو شور مچایا جاتا ہے روز مرہ جس عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے جو جذبہ ہمیشہ اُبھارا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں اس لیے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ کا اصل عنصر صرف یہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے موقع اور محل کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے''۔

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا ان کے کارناموں اور منظور شدہ تجاویز کی روشنی میں موازنہ کر کے بتایا ہے کہ ''لیگ'' صرف حکومت کے خوشامدیوں، آرام طلب نوابوں، اور عشرت پرست رئیسوں کی انجمن ہے اور کانگریس ایک عملی جماعت ہے جس کی وجہ سے ''سلف گورنمنٹ کا قدم برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے''۔

اسی ذیل میں مخلوط انتخاب کی حمایت کی ہے اور مسلم لیگ کے مطالبۂ جداگانہ انتخاب کا نہایت پرزور لفظوں میں مذاق اڑایا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد: مسلم لیگ کی سیاست کے برخلاف مولانا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے ان کا یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے ان غلط تاریخی واقعات پر محققانہ مقالات لکھے جن کی عام شہرت

ہندو و مسلمانوں میں تفرقہ کا باعث ہوسکتی تھی۔ مثلاً ''اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'' ''مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی''۔ ''ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر'' ''بھاشا زبان اور مسلمان'' ان علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ مولانا نے جو سیاسی مقالات لکھے ہیں ان میں بار بار اور جا بجا ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت وضرورت پر زور دیا ہے اور ''لیگ'' اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جو بنانا چاہتی تھی اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا کے ایک مقالہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں موصوف نے ایسی صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ گویا تاریخ کی عدالت میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ اس سے ہمارے برادرانِ وطن کو اندازہ ہوگا کہ علماء فرنگی سیاست کے دام میں نہ پھنس سکے ان کے دل ودماغ کس قدر صاف، انصاف پسند اور محبت آشنا تھے اور وہ ملکی معاملات میں کس عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور وسعت قلب ونظر سے کام لینے کے خوگر تھے۔ فرماتے ہیں:

> ''مسائل پالیٹکس کا یہ ایک اہم مسئلہ قرار دے دیا گیا ہے یعنی چونکہ ان دونوں قوموں میں اتحاد ناممکن ہے اس لیے پولیٹکل معاملات میں ہمارا اور ہندوؤں کا کوئی اسٹیج نہیں بن سکتا''۔

اس دلیل کے اگر چہ دونوں ٹکڑے غلط ہیں لیکن اس فتنہ کو جس قدر کوئی بھڑکانا چاہے۔ بھڑکا سکتا ہے...... تاریخی ترتیب اور منطق کے استدلال تمثیل کے لحاظ سے ہم کو ہندوؤں کی پچھلی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے یہ ظاہر ہے کہ ہندو کبھی ایران وعرب پر چڑھ کر نہیں گئے تھے۔ اس کی بجائے ان کے ملک پر خود ہم نے حملہ کیا ہم نے ان کا مشہور کعبہ ''سومنات'' برباد کر دیا۔ ہم نے بنارس اور متھرا کے شوالے ویران کر دیئے[1]

---

[1] مولانا جتنے بڑے محقق اور فاضل تھے۔ اسی قد جذباتی بھی تھے۔ ان سطور کی اشاعت کے بعد ان کو خیال آیا کہ شدت جذبات میں ایسی بات کہہ گئے ہیں جس کی محققانہ تردید وہ خود اپنے علمی مقالات میں کر چکے ہیں۔ اس بناء پر اس کے فوراً بعد انہوں نے ایک اور مقالہ لکھا اور اس میں بتایا کہ

''مسلمانوں نے جتنی بت شکنیاں کیں مذہبی تعصب سے نہ تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مذہب اور پالیٹکس مخلوط تھے یعنی حریف کی ملکی قوت کا مٹانا بغیر اس کے نہیں ہوسکتا تھا کہ اس مذہبی طاقت کو بھی مغلوب کر دیا جائے آج ایسے روشن زمانہ میں لارڈ کچز کو مہدی سوڈانی کی قبر اسی غرض سے اکھڑوا کر برباد کر دینی پڑی اور خود ہندوؤں نے اسی ضرورت......

''ہندوؤں کی خاندانی روایتیں ان زخموں کو ہمیشہ ہرا رکھتی ہیں لیکن جب اکبر نے ایک دفعہ محبت کی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لیا تو بھی زخم خوردہ دل محبت سے چور تھے۔ بہادر راجپوتوں اور مہراجوں نے نہ صرف جان و مال بلکہ اپنا ننگ و ناموس تک حوالہ کر دیا۔ یعنی بیٹیاں تک دے دیں۔ یہ اکبر کا جبر اور راجپوتوں کا خوشامدانہ کام نہ تھا جبر اور خوشامد دل کی رگوں میں گھر نہیں کر سکتے۔''

اس کے بعد ایک مؤرخ کی حیثیت سے بتایا ہے کہ مغل سلاطین کے عہد میں ہندو مسلمانوں کی لڑائیاں مذہب کی وجہ سے ہرگز نہیں تھیں بلکہ سیاسی معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے تھیں مثلاً عالمگیر کے مقابلہ میں اگر ہندو تلوار لے کر بڑھے تو اس لیے نہیں کہ وہ مسلمان تھا بلکہ اس لیے کہ وہ شاہجہان کی مرضی کے خلاف داراشکوہ کا باغی تھا۔ اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''اکبر کے دربار کے ستون اعظم بیرم خاں، خان اعظم کوکلتاش، بہادر خان صوبیدار تھے۔ ان میں کس کا دامن بغاوت کے داغ سے پاک ہے؟ لیکن یہ بدنامی کسی ہندو راجہ نے نہیں اٹھائی''۔

اکبر تو خیر اکبر تھا جس سے ہندو یوں بھی محبت کرتے تھے اورنگزیب عالمگیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عالمگیر دکن چلا گیا اور پچیس برس تک دہلی کا پایۂ تخت خالی رہا اس سے بڑھ کر راجپوت راجاؤں کے لیے کیا عمدہ موقع تھا کہ دہلی پر حملہ آور ہوتے یا کم از کم راجپوتانہ میں علمِ بغاوت بلند کرتے لیکن جے پور اور جودھپور میں جو راجپوتی طاقت کا مرکز تھے نکسیر تک نہ پھوٹی۔''

''یہ پرانی داستان تھی آج بھی دیہات اور قصبات میں چلے جاؤ تو ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں وہ اسی طرح مسلمانوں کی تقریبات میں شریک ہوتے

...... سے اپنے زمانۂ اقتدار میں سینکڑوں مسجدیں برباد کر دیں اسی بناء پر مسلمانوں نے حملہ کے وقت بت خانے گرائے لیکن امن و امان اور تسلط کے بعد کبھی کوئی بت خانہ نہیں گرایا، اور جو بت خانے گرائے گئے ان کے خاص پولیٹکل اسباب تھے۔ (مقالات شبلی، ج:۸، ص:۱۷۹)

ہیں جس طرح خود ان کے عزیز و اقارب شریک ہوتے ہیں''۔

خود اعتمادی: مولانا ہندو مسلم اتحاد کو ضروری جانتے ہیں مگر اس لیے نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ وہ اکثریت کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں اور ان کے لطف و کرم کے سہارے جئیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ انصاف کا، انسانیت اور دیانت کا، حب وطن اور ملک کے فلاح و بہبود کے جذبہ کا یہی تقاضہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اخبار ''پائنیر'' کے کسی مسلمان نامہ نگار نے لکھا کہ ترکی اور ایران کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کا غیر ملکی وقار کم ہو گیا ہے اس لیے اب ان کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیے تو مولانا نے اس پر برہم ہو کر لکھا:

> ''ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی رہے گی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے وہ اسلام کا ننگ ہے۔ کیا ہم کو ہمسائیوں کے دامن میں اس لیے پناہ لینی چاہیے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا؟ کیا اگر ترکی اور ایران پُر زور ہوتے تو ہمارے ہمسایہ کے مقابلہ میں مدد کر سکتے؟''

اس بیان کا آخری فقرہ پڑھیے۔ اس میں کس طرح اُن مسلمانوں کو تنبیہ ہے جو ہندوستان میں رہتے ہوئے ترکی، ایران یا افغانستان کی طرف نگاہ رکھتے ہیں ایک طرف ترکوں کے ساتھ مولانا کی یہ محبت کہ ''اپنی کھال کو ان کے جوتوں کے تسمہ کے لائق'' بھی نہیں سمجھتے اور دوسری جانب ملکی معاملات میں ان کی خالص ہندوستانیت، اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ایک صحیح الخیال اور سلیم الفکر مسلمان اسلامی اخوت و برادری کے عالمگیر رشتہ کے ساتھ ملکی معاملات میں کس طرح ایک کٹر ہندوستانی ہوتا ہے۔ قارئین کو شاید یاد ہو مولانا محمد علی مرحوم نے بھی گول میز کانفرنس میں ایک موقع پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''جب اسلام کا معاملہ آئے گا تو میں اول و آخر مسلمان ہوں لیکن ملکی معاملات میں صرف ہندوستانی ہوں۔''

اردو اور ہندو: اردو زبان کی نسبت مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے جو ڈر تھا اس کے متعلق بھی مولانا کے الفاظ سننے کے قابل ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ ہندو ہماری قومی زبان اردو کو مٹا رہے ہیں۔ لیکن کیوں کر؟ کیا اس طریقہ

سے کہ اردو زبان کے عمدہ سے عمدہ تر میگزین اور رسالے (ادیب اور زمانہ) ہندو نکال رہے ہیں اور اردو مصنفین کی قدر افزائی کر کے بہت سے انشاپردازان اردو تیار کر رہے ہیں؟ کیا اس طریقہ سے کہ ممالک متحدہ کے قابل ہندو انشاپردازی میں مسلمان انشاپردازوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں؟ زمانہ کے اوراق الٹتے ہوئے بارہا میں نے ہندو مضمون نگاروں کو رشک کی نگاہ سے دیکھا ہے! کیا اس طریقہ سے پولیٹکل معلومات کے لحاظ سے اردو کا بہترین پرچہ ''ہندوستانی'' رہے جس کو ایک ہندو آڈٹ کرتا ہے۔؟

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اردو پرستی کا کیا ثبوت دیا ہے؟ ممالک متحدہ میں اس کا کون سا علمی پرچہ ہے؟ ان کی انجمن اردو کس مرض کی دوا ہے؟ اردو مصنفین کی کیا قدر افزائی کی جارہی ہے؟

انگریزوں کی پہلی پاکستانی کوشش: ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے صوبۂ بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا۔ یعنی اس صوبہ کے کچھ علاقے کاٹ کر آسام سے ملا دیئے گئے لارڈ کرزن کے لفظوں میں اس کا مقصد یہ تھا کہ ''ایک اسلامی صوبہ بنا دیا جائے''، ہم اس کو انگریزوں کی پہلی پاکستانی کوشش کہتے ہیں جس کا اصل مقصد ہندو مسلمان میں تفرقہ کی ایک آہنی دیوار قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد ایجی ٹیشن سخت ہوا تو ۱۹۱۱ء میں اس کی منسوخی کا اعلان کر دیا گیا اس اعلان سے جہاں فرقہ پرور مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ قوم پرور مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی مولانا شبلی بھی اس خوشی میں شریک ہوتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اب اس طمانچہ سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر جائے گا چنانچہ تمام فرقہ وارانہ اور غلط لیگی خیالات کی پرزور تردید کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''ان تمام خیالات سے اگرچہ ہمارے فرضی رہبروں کا گروہ مخالف ہے لیکن مخالفت کا اب نفسِ واپسیں ہے۔ قوم تیس برس تک احمق بن چکی اب اس کے حال پر رحم کھانا چاہیے اور قوم کو سمجھنے دینا چاہیے۔ کہ یہ پولیٹکل سوانگ حقیقت میں پالیٹکس نہیں ہے''۔

ہم کو اس کا احساس ہے کہ مولانا شبلی کے مذکورہ بالا اقتباسات طویل ہو گئے ہیں جو اگرچہ خود ان کی تحریروں کی نسبت سے بہت کم اور مختصر ہیں لیکن ہم نے اس طوالت کو اس لیے گوارا کیا ہے کہ مولانا کے یہ

افکار تنہا ان کے افکار نہیں تھے بلکہ تمام علمائے ہند کے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ مولانا کے ہاتھ میں قلم تھا اور وہ بھی بہت پرزور و اثر انگیز، الندوہ اور مسلم گزٹ دونوں انہیں کے پرچے تھے پھر جدید تعلیم یافتہ گروہ سے بہ نسبت دوسرے علماء کے مولانا قریب بھی زیادہ تھے اس لیے ان کے افکار و اعمال دیکھتے تھے تو برہم ہو جاتے اور اپنی تحریروں میں ان پر تنقید کرتے تھے علاوہ بریں ایک بات یہ بھی تھی کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانگریس بھی اس وقت تک حقوق طلبی اور سلف گورنمنٹ (زیر سایہ گورنمنٹ) کے مطالبہ کی منزل سے آگے بڑھی نہیں تھی اور علمائے دیوبند کو اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ خاموشی کے ساتھ آنے والی جنگ آزادی کے لیے بہادر سپاہی تیار کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔

دیوبند اور ندوہ: بعض حضرات دیوبند اور ندوہ کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ واقع یہ ہے کہ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر جن علمائے کرام نے ندوۃ العلماء جیسے مدرسہ کی تجویز کا خاکہ تیار کیا تھا ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ بھی شامل تھے۔[1]

جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں مولانا نانوتوی بھی علوم جدیدہ کی اہمیت کے قائل تھے اور مولانا شبلی بھی۔ اختلاف صرف اس میں تھا کہ علوم جدیدہ کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو یا علوم قدیمہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر۔ مولانا شبلی پہلی شق کے قائل تھے اور مولانا نانوتوی دوسری شق کے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض مذہبی مسائل میں بھی اختلاف تھا، ممکن ہے یہ اختلاف غلط فہمی پر مبنی ہو جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست اور حکومت سے مرعوب ہو کر ہندوؤں سے الگ رہنے کا تعلق ہے علمائے ندوہ اور علمائے دیوبند بلکہ ہندوستان کے تمام ہی ہر مشرب و مسلک کے علماء متحد اور ایک تھے۔ چنانچہ ترک موالات کا فتویٰ پانچ سو علماء کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد: اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ''الہلال'' و ''البلاغ'' اس شان اور اس انداز سے نکالا کہ ملک کے کونہ کونہ میں آگ لگ گئی مسلمانوں کے عروق مردہ میں جوش و ولولہ کا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے حیات شبلی، ص: ۳۰۴۔۳۰۵.

خون دوڑنے لگا۔ان میں حکومت سے متصادم ہونے کی جرأت پیدا ہوگئی سیاسی معاملات میں ان کا نقطہ نظر بالکل غیر فرقہ ورانہ ہوگیا۔ ہندواور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھائی بھائی جیسے ہو گئے خدا کے فضل وکرم سے مولانا اب بھی بقید حیات ہیں اس لیے ان پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ برادرانِ وطن اب تو معلوم نہیں ان کی نسبت کیا رائے رکھتے ہوں گے لیکن دنیا جانتی ہے کہ ماضی قریب میں کانگریس کی زندگی میں کتنے ایسے نازک مرحلے آئے جبکہ مولانا کی رہبری خضر راہ ثابت ہوئی۔اور جبکہ کانگریس نام تھا مولانا آزاد کا۔اور مولانا آزاد تھے کانگریس!

؎ مجھے یاد ہے ذرا ذرا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ ورانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے ہیں۔قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا بلکہ انہوں نے ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا جن میں سب سے اوّل مولانا شبلی نعمانی تھے۔

مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے اور رسالہ جات موسوم بہ ''الہلال'' و''البلاغ'' کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی روح پھونکی اور اس وقت سے نہایت استقلال اور استقامت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم ہیں''۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں ایڈیشن،ص:۳۸۲)

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ: ہر چند کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام کے زبان وقلم نے غفلت کدۂ ہند کے خس وخاشاک میں آگ لگا رکھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت ''انڈین نیشنل کانگریس'' کا قدم بھی حقوق طلبی کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا۔ٹھیک اسی زمانے میں دیوبند نامی قصبہ کے ایک گوشہ میں ایک عالم ربانی وعارف یزدانی تھا جو اپنے کام ودھن

میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا اور نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم، اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ روسو اور مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعۂ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن واسپنسر کے افکار ونظریات سے، اُس نے نہ تمدن جدید کی کسی دلکشی کا حظ اٹھایا تھا اور نہ اس عشرت کدۂ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازہ حیات قال اللہ قال، الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنت نبوی تھا۔ اس کے فکر ونظر کا تار و پود احکام الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا وہ دیکھنے میں منحنی اور لاغر ونحیف تھا مگر سینہ میں صبر واستقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ بہ ظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سے سب سے الگ تھلگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل ونہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے درد وگداز اور جذب وسوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں میں اور جلوتوں میں رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اجالے میں کبھی جنگ بلقان وطرابلس کے واقعات پڑھ کر خوشابہ فشانی کرتا تھا اور کبھی ملک ووطن کی زبوں حالی ووماندگی پر نوحہ کناں ہوتا تھا دیوبند کے آسمان پر جگمگانے والے ستاروں کو شاید اب بھی یاد ہو کہ اس زمانہ میں کتنی گرم وسرد راتیں جو اس پیر مرد نے یوں ہی اپنے بوریہ پر رنج وکرب کی کروٹیں بدلتے اور درد والم کی پرسوز آہیں بھرتے گذار دیں۔ اس کی مادی زندگی کا اثاثہ:

بوریائیست کہ در کلبۂ احزاں داریم

سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن جس کی نگاہ میں جاہ وجلال محمدی نے گھر کرلیا ہو اور جو ''**الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل**'' کی عینک سے قدرت لم یزلی کی بے پناہی کا مشاہدہ کر چکا ہو اس کے نزدیک صولت سکندری ودبدبۂ کیخسروی کی بھی کیا حقیقت ہوسکتی تھی، سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیان طلباء اور اساتذہ کا اجتماع آپ کے مکان پر ہوتا تھا تو آپ کسی سے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' بڑی پابندی سے خود سنتے اور دوسروں کو سنواتے تھے۔ ترکوں کی مظلومیت وبے کسی کا کوئی واقعہ سنتے تو رو پڑتے اور ان کی اولوالعزمی وبہادری کا ذکر آتا تو جوش وخروش اور فرط انبساط کے باعث چہرہ تمتما اُٹھتا اور آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ اسی روزانہ مجمع کے کسی مولوی صاحب نے ایک روز کہا کہ حضرت! الہلال والبلاغ میں تو تصاویر ہوتی ہیں آپ پھر بھی ان کو اس قدر محبوب رکھتے ہیں حضرت کم سخن

اور کم گو مگر نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے جواب میں یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی لیکن یہاں حضرت شیخ الہند اس حکومت کا تختہ الٹ دینے کا ہی نقشہ تیار کر رہے تھے اس کی کن پھن حکومت کو بھی پہنچ گئی اور لارڈ مسٹن دیوبند آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کیا اساتذہ اور طلباء سے ملاقاتیں کیں لیکن حضرت شیخ الہند نے غصہ اور رنج کے مارے اس روز گھر سے باہر قدم نہیں رکھا کیوں؟ اس لیے لارڈ مسٹن انگریز تھے اسلام میں اس طرح کی قومی عصبیّت اور ملکی و نسلی تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ صوبہ متحدہ و اودھ کے یہ ہی گورنر تھے جنہوں نے مسجد کانپور کے واقعۂ ہائلہ کے سلسلہ میں معصوم بچوں اور مردوں پر گولیاں چلا کر ان کو شہید کیا تھا اور اس کے بعد لارڈ صاحب مسلمانوں کو اپنانے اور ان کے دلوں سے .... غم و غصہ دور کرنے کے لیے علماء سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

حضرت شیخ الہند کا سیاسی پروگرام: حضرت شیخ الہند عالم اسلام اور خود اپنے ملک پر انگریزوں کی چیرہ دستیاں دیکھتے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے بہ ظاہر ان کی حیثیت یہ تھی کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس اول تھے حدیث کا درس دیتے تھے لیکن جس نے مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کے ساتھ غایت قرب و تعلق کی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کے دل کی دھڑکن اپنے قلب میں سمیٹ لیا ہو وہ صرف مدرسی اور خانقاہ نشینی پر قناعت نہیں کر سکتا تھا آپ نے نہایت منظّم اور باقاعدہ طریقہ پر ہندوستان سے انگریزی راج ختم کر دینے کا پروگرام مرتب کیا۔ حسن اتفاق سے شاگردوں میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سید انور شاہ، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہم ایسے ارباب عزیمت و استقامت مل گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے استاذ کی علمی نیابت کی اور باقی حضرات نے حضرت کے سیاسی پروگرام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

کابل میں کانگریس کا کام: حضرت شیخ الہند انڈین نیشنل کانگریس کے پروگرام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا یقین تھا کہ جب تک باہر کی طاقتوں میں سے کسی طاقت سے کام نہیں لیا

جائے گا محض حقوق طلبی کی جنگ کے ذریعہ آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس بناء پر آپ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم دیا۔ یہ خاص مشن کیا تھا؟ اور مولانا نے کابل پہنچ کر کیا کیا؟ اس کا حال خود مولانا کی زبانی سنیئے فرماتے ہیں:

''۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا...... کابل جا کر مجھ کو معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل غیر منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے خادم کی شیخ الہند کو اشد ضرورت تھی اب اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اسی وقت سے میں کانگریس کا داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کیا گیا سشن نے منظور کرلیا۔ یہ برٹش امپائر سے باہر پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں''

(خطبات مولانا عبید اللہ سندھی، ص: ۶۸۔۶۹)

مولانا کا یہ بیان غور سے پڑھیئے اس میں صاف مذکور ہے کہ مولانا حضرت شیخ الہند کے بھیجے ہوئے کسی خالص اسلامی یا صرف مسلمانانِ ہند کے لیے کسی کام کی غرض سے کابل نہیں گئے تھے بلکہ وہ کام ''ہندوستانی''، یعنی ایک ملکی اور وطنی کام تھا جس کا فائدہ ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا۔ کیونکہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور یہ کشتی کسی دست غیب کی مدد سے غلامی کے بھنور سے نکل کر آزادی کے ساحل

سے ہمکنار ہوتی تو دونوں ہی اس سے شاد کام ہوتے ۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مولانا شروع شروع میں یہ ہندوستانی کام ''اتحاد اسلامی'' کی بنیاد پر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جن بیرونی طاقتوں سے وہ اس معاملہ میں مدد لینا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی ترکی اور افغانستان وہ اسلامی طاقتیں تھیں اور ایک غیر افغانی اور غیر ترکی مسلمان کی آواز ان کے لیے اسی وقت قابل شنوائی و پذیرائی ہوسکتی تھی جبکہ ان کے جذبات کو اسلامی اخوت واتحاد کے عنوان سے اُبھارا جاتا لیکن کابل پہنچنے کے ایک سال بعد ہی مولانا کو یہ صاف محسوس ہوگیا کہ آم کے درخت سے جامن کی اُمید نہیں کی جاسکتی سوال جب صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا اور سب ہندوستانیوں کا ہے تو اس کو ایک خالص مذہبی رنگ میں کیوں کر چلایا جاسکتا ہے اس بناء پر امیر حبیب اللہ خاں جیسے شخص نے بھی مولانا کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگریس کے نام سے کام کرنے کا مشورہ دیا اور مولانا نے فوراً اپنے کام کا نہج اور طریق بدل دیا۔

حضرت شیخ الہند کا اصل مقصد: مولانا سندھی جس کو ہندوستانی کام کہتے ہیں اب خود اپنوں کی نہیں بلکہ غیروں کی بھی۔یعنی ان کی جو ہمیشہ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے شہادت سن لیجیے کہ وہ ہندوستانی کام کیا تھا؟ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں حضرت شیخ الہند کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے درج ہے:

> ''اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کا ایک شاگرد مولوی عبداللہ کابل چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے جرمنی اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا اسی سال ستمبر میں مولوی محمود حسن مکہ معظّمہ چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے غالب پاشا کا دستخطی اعلان مولوی محمد میاں کے ہاتھ مولوی عبیداللہ کے پاس کابل بھیجا جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی ۔ان اصحاب نے یہ طے کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد ہندوستان میں ایک عارضی حکومت (Intrim govt) قائم کی جائے جس کے پریزیڈنٹ راجہ مہندر پرتاب سنگھ ہوں جو ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے اور ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلقات رکھتے تھے''۔
>
> (رپورٹ رولٹ کمیٹی، اردو صفحات ۲۵۳۔۲۵۴)

رپورٹ کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد ملک کے مشہور فاضل مولانا سید طفیل احمد منگلوری بجا طور پر لکھتے ہیں۔

''اس سے یہ واضح ہوگیا کہ برطانیہ کے خلاف مولوی محمود حسن کی تحریک مذہبی نہ تھی بلکہ سیاسی تھی اس لیے کہ انہوں نے اپنی مجوزہ حکومت کا صدر ایک ہندو کو قرار دیا تھا پس مسلمانوں کی بابت یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہبی مجنوں ہیں اور انگریزوں یا ہندوؤں سے مذہبی تعصب رکھتے ہیں اور اسلامی حکومتوں سے تعلقات رکھ کر ان کے ذریعہ ہندوستان میں کوئی مذہبی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولوی صاحب موصوف کی تحریک کا منشا ہندوستان میں بلا امتیاز مذہب وملت خالص ہندوستانیوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں ایڈیشن،ص:۳۸۶)

حضرت شیخ الہند کے جذبہ،طرز فکر اور سیاسی رجحان طبع پر اس واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ سیوہارہ ضلع بجنور میں ایک بزرگ ہیں جو فتویٰ پوچھے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے انہوں نے ایک مرتبہ خط کے ذریعے حضرت شیخ الہند سے دریافت کیا کہ گاندھی کیپ اوڑھنا مذہباً کیسا ہے؟ آپ نے جو جواب لکھ کر بھیجا وہ مستفتی کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔فرماتے ہیں:

''گاندھی ٹوپی چونکہ ایک ایسی جماعت کا شعار ہے جو حریت طلب اور انگریزی حکومت کی شدید مخالف اور اسی وجہ سے انگریز بھی اس کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے اس بنا پر بندہ کے نزدیک گاندھی ٹوپی کا استعمال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے جائز ہے بلکہ باعثِ ثواب اور مستحسن ہے۔''

تحریک شیخ الہند کی عظمت اور گیرائی:

علاوہ بریں مسلمانانِ ہند کے لیے یہ امر بھی کچھ کم قابل فخر نہیں ہے کہ عصر حاضر کی سب سے بڑی تحریک سوشلزم وکمیونزم کے نفس ناطقہ ''سوویٹ روس'' سے انڈین نیشنل کانگریس کا سب سے پہلے جس شخص نے تعارف کرایا وہ مسلمان ہی تھا یعنی مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا خود اپنی روئدادِ حیات قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔سات مہینے ماسکو میں رہا سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں

کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں''۔
میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس، دوم اپنے ہندوستانی رفقا جن میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی سوشلسٹ اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون ہوں اور شکر گزار رہوں گا اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصیص اور امتیاز کو کبھی بھی حاصل نہ کر سکتا''۔

(خطبات مولانا عبیداللہ سندھی، ص:۶۹)

ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند اور مسٹر ساورکر ایسے کتنے سیاسی کارکن ہیں جو جلاوطنی کی مدت گذارنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئے لیکن حضرت شیخ الہند کے فیض صحبت کا یہ اثر ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی پچیس سال تک ہندوستان سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے شدید سے شدید قسم کے مصائب اور آلام سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ حضرت شیخ الہند کے جس مشن یعنی (ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد) پر وہ گئے تھے ایک لمحہ کے لیے اس سے غافل نہیں ہوتے اور یہ سارا زمانہ اسی مقصد عظیم کے لیے ادھیڑبن میں گذار دیتے ہیں ۱۹۳۹ء میں وہ واپس آئے تو انہیں افکار کو لے کر آئے۔ حالانکہ یہ زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فرقہ ورانہ سیاست کے شباب کا تھا۔ اپنے ایک خطبہ میں کس وضاحت سے فرماتے ہیں:

''ہمارے پروگرام کا سب سے اہم جزیہ ہے کہ ہم سیاسیات ہند میں اپنا حصہ اپنے قبضہ میں لانا چاہتے ہیں اور ابھی سے اس کی تیاری کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں ہمیں بیرونی مسلمانوں کی کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ آور ہو تو خواہ وہ مسلمان کیوں نہ ہو ہم اس کا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان طاقت کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ ہماری موجودگی میں وہ اسلام کے نام پر ہندوستان کی سرزمین کو پامال کرنے کی کوشش کرے کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہمیں اپنے وطن میں حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بیرونی مسلم ممالک کو اپنی حکومتوں کو مستحکم اور منظم کرنے کا حق حاصل ہے مگر ہم ان کے

اس حق کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے کی کوشش
کریں یہ ہمارا حق ہے کہ ہم ہندوستان میں ہندوستانی حکومت قائم کریں!!

(خطبات، ص:۱۹۶)

جن لیڈروں نے مسلمانوں کی توجہ مسلم ممالک کی طرف منعطف کر کے انہیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ملکی مسائل و معاملات پر غور کرنے سے باز رکھا ہے ان کی شدید مذمت اس طرح کرتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کی توجہ ہمیشہ اجنبی امداد کی طرف مصروف رہی یا مصروف رکھی گئی اُنہیں
اپنے فیصلہ سے اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کے خیال کی طرف نہ لایا گیا ہے
اور نہ آنے دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس غلط روی میں حصہ لیا انہیں پہلے دور میں تو قابل
معافی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس کی بیداری کے زمانہ میں جب یہ بات روزِ روشن کی طرح
عیاں ہو چکی ہے کہ کسی بیرونی مدد پر بھروسہ کرنا ہمارے لیے زہرِ قاتل ہے کسی ایسے شخص کو
معاف نہیں کیا جائے گا جو آج بھی اس وہم باطل میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرے''۔[1]

(خطبات، ص:۱۹۸)

امام الہمام علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری: مولانا عبید اللہ سندھی تو خیر پھر بھی سیاسی تھے اور ان کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں بسر ہوئی تھی حضرت شیخ الہند کے دوسرے تلمیذ خاص اور تربیت یافتہ اور صحیح علمی جانشین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کے افکار سیاسی کو ملاحظہ فرمائیے تو یہاں بھی آپ کو وہی چیز ملے گی یہ ظاہر ہے کہ حضرت الاستاذ سراپا علم و فضل تھے۔ آپ کا مشغلہ کتب بینی، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے سوا کچھ اور نہ تھا اور اسی وجہ سے آپ موجودہ سیاست کی زبان میں گفتگو سے بھی نا آشنا تھے۔ جو بات دل میں ہوئی اسے برملا اور صاف صاف کہتے تھے حضرت الاستاذ نے جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء میں صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا ہم ذیل میں اس خطبہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ انگریز جس جماعت کو مذہبی دیوانے (Fanatics) سمجھ کر ہمیشہ اپنے لیے سخت خطرناک سمجھتی رہی اس جماعت کا وطن دوستی اور برادرانِ وطن کے ساتھ صلح و دوستی

[1] مولانا سندھی کے افکار سیاسی پر ہم اس مضمون میں آگے چل کر مستقلاً گفتگو کریں گے۔ اس لیے یہاں اس قدر لکھنا کافی ہے۔

کے تعلقات رکھنے کے باب میں کس قدر صاف واضح اور روشن رویہ تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب نے جس زمانہ میں خطبہ پڑھا وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو مسلم فسادات مسلسل پانچ چھ برس سے ہو رہے تھے اور مسلمان کانگریس کی رجعت پسندانہ ذہنیت سے تنگ آ کر اس سے یک گونہ بیزاری محسوس کرنے لگے تھے تاہم ملاحظہ کیجیے حضرت شاہ صاحب کا خطبہ کس درجہ عالی حوصلگی اور بلند ہمتی و حریت طلبی کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔

مسلمان اور وطن دوستی: ''ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں جو زبان حال سے ان کے علم و ہنر پسندی اور حب وطن کی شہادت دے رہے ہیں موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کی آب و گل سے ہے۔ ان کو ہندوستان کی سرزمین سے ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک محبّ وطن کو ہونی چاہیے اور کیوں نہ ہو؟ جبکہ ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حبِ وطن کے باب میں اسوہ موجود ہو...... آپ نے اپنے وطن مکہ معظّمہ کو خطاب کر کے فرمایا ''خدا کی قسم! خدا کی تمام زمین میں، تُو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے لیے جو دعا کی تھی اس کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حبِ وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ سچا مسلمان ہو کر اس جذبۂ حب وطن سے خالی ہو۔ پس یقین رکھیے کہ مسلمانوں کے قلوب میں ہندوستان کے ساتھ پوری محبت ہے اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی رہتی ہیں اور ہندوستان ان کا بھی وطن ہے اس لیے طبعی طور پر ان کو بھی ہندوستان کے ساتھ محبت ہونی چاہیے اس لیے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے''۔

(ص:۱۹۔۲۰)

مسلمانوں پر بیرونی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت: مسلمانوں پر بھی بیرونی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت کا فرض ایسا ہی عائد ہوتا ہے جیسا کہ ہندوؤں پر، اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اگر آج مسلمانوں کو اکثریت کی تعدی کے خطرہ سے محفوظ کر دیا جائے تو وہ ہندوستان کی طرف سے ایسی ہی مدافعانہ طاقت ثابت ہوں گے جس طرح اپنے وطن سے کوئی مدافعت کرتا ہے۔
> یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا نہایت پست خیالی ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسائیوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہوں گے اور ہمسائیوں کی زیادتیوں کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اگر چہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو۔''

(ص:۲۱)

ایک نہایت اہم نکتہ: اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب نے ایک نہایت اہم امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں کے مذہبی حقوق محفوظ ہیں اور وہ اپنی ملکی حکومت میں اپنا حصہ بھی رکھتے ہوں تو اب نہ صرف یہ کہ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف، خواہ مسلمان ہی ہوں ہندوستانی مسلمانوں پر برادرانِ وطن کے دوش بدوش ملک کی حفاظت کا بھی شرعی فرض ہوگا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے معاہدہ کا احترام کریں اور اس بناء پر ہندوستان کو فتح کرنے، اُس کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے کا خیال نہ کریں گویا ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر کے ہندوستان کے ہندو عالمِ اسلام کی کسی بھی طاقت کے حملہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور صرف یہ ہی نہیں وقت پڑنے پر وہ عالم اسلام کی مدد کی توقع بھی کر سکتے ہیں عالمِ اسلام کا مذہبی فرض ہوگا کہ اگر ہندوستان پر کوئی حملہ کرے تو وہ ہندوستان کی حمایت اور اس کی طرف سے مدافعت کرے۔ ملاحظہ

فرمایئے حضرت شاہ صاحب اس حقیقت کو کس قدر واضح اور صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''اس سے زیادہ ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ جب مسلمانانِ ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے ان کا معاہدانہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہباً اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاہدہ کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس معاہدہ کا پورا پورا احترام کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ذمة المسلمين واحدة يسعىٰ بها ادناهم.

مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے ان میں سے ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں پر اس کا احترام لازم ہے۔

اس کے بعد کس جزم و یقین اور قوت سے فرماتے ہیں:

''میں نہایت بلند آہنگی سے برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ معاہد کرلیں اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار اور مخلص ہمسایہ پائیں گے کیونکہ مسلمان بحیثیت مذہب کے قرآن پاک کے حکم کے بموجب معاہدہ کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئا ولم يظاهروا عليكم احدًا فاتموا اليهم عهدهم الىٰ مدتهم ان الله يحب المتقين.

جن غیر مسلموں سے تم نے معاہدہ کیا ہو اور انہوں نے ایفاء عہد میں تمہارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی۔ تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو بیشک اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

اور فرمایا:

فاستقاموا لكم فاستقيموا لهم ان الله يحب المتقين.

جب تک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تو تم بھی سیدھے رہو بے شک اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (خطبہ صدارت پشاور، ص:۲۲،۲۱)

اسی بات کو مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جن کے علم وفضل کا شہرہ ہندوستان سے باہر عالمِ اسلام تک میں پہنچ چکا ہے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

''ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دیار اسلام کو دشمنوں سے آزاد کرائے اور اس میں اپنی جان تک کی قربانی گوارہ کرے وہ جس ملک میں بھی ہو اس ملک کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے صحابۂ کرامؓ مکہ سے ہجرت کر کے حبش جاتے ہیں۔ وہاں ایک دشمن کا لشکر ملک پر حملہ آور ہوتا ہے۔ صحابہ حبش کے بادشاہ نجاشی کے سامنے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور ملک کی حفاظت میں حبشیوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں''۔

(خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۶ء، ص: ۴۷)

دارالاسلام یا دارالامان: حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ الکشمیریؒ نے اس خطبہ میں بحیثیت ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ کے ایک اور اہم بحث بھی اُٹھائی ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی حیثیت انگریزوں کے دورِ حکومت میں کیا ہے؟ اور آزاد ہونے کے بعد اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ وہ دارالاسلام ہوگا یا کیا؟ اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ نے بڑی نکتہ آفرینی اور ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ملک کی دو ہی قسمیں ہیں دارالاسلام یا دارالحرب۔ پھر دارالاسلام کی تعریف میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کے نزدیک دارالاسلام اس ملک کو کہتے ہیں جہاں اسلامی دستور نافذ ہو۔ حدود اللہ قائم ہوں اور تمام معاملات وخصوصیات کا فیصلہ اسلامی احکام کی روشنی میں کیا جاتا ہو۔ اس تعریف کے پیش نظر وہ ممالک بھی دارالاسلام نہیں کہلائے جاسکتے جہاں آبادی میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہو اور جہاں کی حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے قبضہ میں ہو لیکن اس کے باوجود حدود اللہ کا وہاں نفاذ نہ ہو۔ زانی اور شراب خور کے کوڑے نہ لگائے جاتے ہوں، رنڈیوں کے چکلہ میں لوگ بے دھڑک آتے جاتے ہوں، شراب کی دوکانوں پر کوئی بندش نہ ہو، سودی کاروبار پر روک ٹوک نہ ہو، رمضان کے مہینہ میں کھلے بندوں کھانے پینے کی قانوناً ممانعت نہ ہو، اسلامی شعائر کی پردہ دری کرنے والوں سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی ہو، عورتیں تبرج جاہلیت کے ساتھ نسوانی حسن کی ایک ایک ادا کو نمایاں کرتی پھریں اور ملک کا مروجہ قانون ان کا دامن پکڑنے سے عاجز ہو۔

دوسری تعریف دارالاسلام کی یہ ہے کہ مسلمان احکام اسلام بجا لانے میں آزاد ہوں اور ان کی جان و مال مکمل طور پر محفوظ ہو۔ اس تعریف کی رو سے وہ ممالک بھی دارالاسلام بن جاتے ہیں جہاں غیر مسلموں کی کوئی آئینی حکومت قائم ہو مگر اس کے آئین و دستور کے اعتبار سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو اور ان کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہو۔

اب اگر ملک کو انہیں دو قسموں یعنی دارالاسلام اور دارالحرب میں محدود کر دیا جائے تو یہ دونوں تعریفیں رداً و عکساً صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ کیونکہ مثلاً پہلی تعریف کے پیشِ نظر مسلمانوں کا وہ ملک جہاں اسلامی قانون نافذ نہیں ہے وہ جب دارالاسلام نہیں ہوا تو دارالحرب ہوا اور ایک مسلمان کے لیے دارالحرب کا یہ حکم ہے کہ یا تو جنگ کرے یا وہاں سے ہجرت کر جائے۔ اسی طرح دوسری تعریف پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ جب جو ملک غیر مسلم حکومت کے زیر نگیں ہو اور مسلمان وہاں مذہبی معاملات میں آزاد ہوں اور دارالاسلام ہوا تو یہاں کے عقود فاسدہ سب کے سب ناجائز ہونے چاہیں حالانکہ ایسا ہونا سخت دقت طلب اور دشواری کا باعث ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب اس پیچیدگی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں کہ ملک فقط دو قسم کے نہیں ہوتے بلکہ تین طرح کے ہوتے ہیں ایک دارالاسلام دوسرا دارالامان اور تیسرا دارالحرب۔ ہندوستان زیر حکومت برطانیہ کے متعلق آپ کا رجحان یہ ہے کہ وہ دارالحرب ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتویٰ کا حوالہ دینے کے بعد یہاں کے حالات کا تذکرہ کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں ''تو آج تو اس کا دارالاسلام نہ ہونا اس سے زیادہ واضح اور روشن ہے'' اور اسی بناء پر وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ دونوں متحد اور متفق ہو کر اپنے وطن کو آزاد کرنے کی سعی کریں مگر چونکہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کو مطلقاً دارالحرب نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لیے فرماتے ہیں۔ ''ہندوستان کو اس موجودہ حالت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے'' ''یہ زیادہ سے زیادہ'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت الاستاذ کا اصل رجحان کیا ہے اچھا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو پھر اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کے جواب میں آپ نے اس معاہدہ کی چند اہم اور ضروری دفعات نقل کی ہیں جو مکہ سے ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے یہود میں ہوا تھا۔ ان دفعات میں سے بعض نہایت اہم دفعات جن کا تعلق ہمارے موضوع بحث سے ہے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

(1) یہ تمام معاہد جماعتیں (یعنی قریش، مہاجرین، انصار، یہودیوں کے مختلف قبائل) دوسری غیر مسلم

غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم شمار ہوگی۔

(2) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ وفساد برپا کرتا اور مخلوق سے ظلماً تاوان وصول کرتا اور خلق خدا کوستاتا ہو۔ تمام مسلمانوں کو متفق ہوکر اس شخص کے خلاف کام کرنا لازم ہوگا اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

(3) جن یہودیوں نے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ ہمدردی وغمگساری کا برتاؤ کریں۔ ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔

(4) مسلمانوں کو پابندی عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارمِ اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔

(5) جن مسلمانوں نے اس معاہدہ کو مان کر اس کی پابندی کا اقرار کرلیا ہے اور وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کے دفعات میں تغیر یا کوئی نئی بات پیدا کریں اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاملہ رکھیں جو عہد نامۂ ہٰذا کا احترام نہ کرتا ہو۔

(6) یہود بنوعوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں، یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے علاوہ باقی سب امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی دوسری جماعتوں کے نام لے کر مثلاً یہود بنی النجار، بنی الحارث، بنوساعدہ، بنوجشم اور یہود بنی الاوس کے متعلق بھی تصریح فرمادی ہے کہ ان تمام یہودی قبائل نے چونکہ معاہدہ کرلیا ہے اس لیے یہود بن عوف کی طرح ان کے بھی حقوق ہوں گے۔

حضرت الاستاذ نے دراصل مندرجۂ بالا اور دوسری دفعات کو نقل کر کے یہ بتانا چاہا ہے کہ:

(1) ہندو اور مسلمان دونوں معاہدہ کرلیں گے تو جس طرح مسلمان اور یہود بنی عوف دوسروں کے بالمقابل ایک جماعت اور ایک قوم تھے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمان بھی دوسروں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم ہوں گے۔

(2) ہندوؤں پر نہ مسلمان خود ظلم کریں گے اور نہ کسی اور کو ان پر ظلم کرنے دیں گے۔

(3) مسلمان ہرگز کسی ایسے شخص سے کوئی واسطہ اور کوئی سروکار نہ رکھیں گے جو ان کے اور ہندوؤں کے

معاہدہ کی خلاف ورزی کرے یا اس کو توڑے۔

بحث کے خاتمہ پر حضرت الاستاذ فرماتے ہیں:

''میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالاسلام یا دارالحرب کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی ومعاشرتی شرائط پر صلح ومعاہدہ کر سکتے ہیں''۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

''جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں دونوں قوموں کو رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے اور دونوں کا وطن یہی ہے۔ اس لیے ہر فرد ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے جس سے یہ روز کا جدال وقتال دور ہو۔ اور ہر شخص امن واطمینان کی زندگی بسر کرے''۔

اس بحث کو اس طرح ختم کر دینے سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں ایک معاہدہ کے پابند ہو کر رہیں تو حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اس حالت میں ہندوستان دارالحرب تو یقیناً نہیں ہوگا! لیکن کیا دارالاسلام ہوگا؟ تو شاہ صاحب کا میلان ادھر بھی نہیں نظر آتا ہے۔ بلکہ دارالامان ہوگا اور از روئے معاہدہ مسلمانوں پر اس ملک کی جو خود ان کا بھی وطن ہے خیر خواہی اور اس کی حفاظت ومدافعت ایسی ہی واجب اور ضروری ہوگی جیسی کہ ہندوؤں پر ہے۔ چاہے وہ حملہ آور کوئی بیرونی مسلم طاقت ہو اور یہ سب کچھ محض ڈپلومیسی نہیں بلکہ از روئے شرع واحکامِ دیں مسلمانوں کو کرنا ہوگا!

(باقی آئندہ)

(بشکریہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی)

ستمبر 1948

آپ کے مسائل اور اُن کا شرعی حل

مولانا حبیب اللہ اختر

سوال

کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو کہتا ہے کہ تو میری طرف سے پکی فارغ ہے اور پھر اپنے سالے کی بیوی کو بھی کہتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو بتا دینا کہ یہ میری طرف سے پکی فارغ ہے. براہِ مہربانی قرآن واحادیث کی روشنی میں واضح کریں کہ اس کی بیوی کو طلاق ہوئی ہے یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو طلاق کی کون سی قسم ہوئی اور اگر اب میاں بیوی آپس میں صُلح کرنا چاہیں تو کوئی صورت ہے یا نہیں؟ سائل: اسرار حسین ولد فضل حسین راولپنڈی

جواب

ایسے الفاظ کہنے والے شخص کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے. اب اگر میاں بیوی صلح کر کے گھر بسانا چاہتے ہیں تو دو گواہوں کی موجودگی میں نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا. اس نکاح کے بعد خاوند کو صرف دو طلاقوں کا اختیار باقی رہ جائے گا.

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنات کے مدرسہ کا مہتمم و منتظم اپنے مدرسہ کی معلمات سے پردہ میں بیٹھ کر براہ راست یا فون یا انٹر کام پر بوقت ضرورت بات چیت کر سکتا ہے؟
شرعی حکم کیا ہے؟ سائل: مولانا غلام مرتضی صاحب

جواب

فقہاء نے عورت کی آواز کو بھی ستر شمار کیا ہے. اس لیے اجنبی مرد و عورت کا آپس میں بات چیت کرنا اصل میں تو جائز نہیں لیکن فقہاء نے دو شرطوں کے ساتھ بوقتِ ضرورت اِس کی اجازت دی ہے.

(1) بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت کلام کیا جائے.

(2) فتنہ کا خوف نہ ہو.

لہٰذا بنات کے مدارس کے مہتممین و منتظمین کے لیے مطلقاً تو اجازت نہیں دی جا سکتی البتہ ضرورت کے وقت بقدر ضرورت بات چیت کی گنجائش ہے، لیکن یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہاں پر کسی بھی جانب سے فتنے اور گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو.

في الدرالمختار: فظهر الكف عورة علي المذهب (والقدمين)علي المعتمد وصوتها علی الراجح.وفي ردالمحتار:(قوله:وصوتَها) معطوف علي المستثنى،يعني: أنه ليس بعورةٍ .... الخ، وفي الكافي:ولاتلبي جهرا،لأن صوتها عورةومشى عليه في "المحيط" في باب الأذان، "بحر"قال فی الفتح و علي هذا لو قيل اذا جهرت بالقراء ة في الصلاة فسدت كان متجها، ولهذا منعها عليه الصلاة والسلام من التسبيح بالصوت لإعلام الإمام بسهوه الي التصفيق .... الخ، ولا يظن من لا فطنة أنا إذا قلنا: صوت المرأة أنا نريد بذلك كلامها؛ لأن ذلك ليس بصحيح، فانا نجيز الكلام مع النساء للأجانب ومحاورتهن عند الحاجةالي ذلك، ولا نجيز لهن رفع أصواتهن ولا تمطيطها ولا تليينها وتقطيعها لما في ذلك من استمالة الرجال اليهن وتحريك الشهوات منهم، ومن هذا لم يجزأن تؤذّن المرأة.(رد المحتارعلى الدر المختار، ج : ٣ ، ص:١٨.٢١).

(۱) ایک بزرگ جو معذور اور بیمار تھے اور ان کی کوئی اولاد بھی نہ تھی، انتقال سے قبل انہوں نے اپنی بہن کو اپنے مال کے متعلق وصیت کی کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد میرے جو پیسے رہ جائیں گے، انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا، مساجد میں دے دینا.

اب سوال یہ ہے کہ یہ مال لازماً مساجد ہی میں دینا ہوگا یا اس سے کسی غریب کی مدد بھی کی جاسکتی ہے. کیونکہ ان کی ایک بھانجی ہے جو بہت غریب ہے، ان کی بہن یہ چاہتی ہے کہ اس پیسے سے اس کی کچھ مدد کریں. پانی کی موٹر وغیرہ لگوادیں. کیا ایسا کرنا غلط تو نہیں ہوگا؟

کیا اس پیسے سے کسی غریب بچی کو تعلیم بھی دلوائی جاسکتی ہے؟

(۲) لوگ کہتے ہیں جو بندہ مرجاتا ہے چالیس روز تک اس کی روح آتی ہے اور چھت کی منڈیر پر بیٹھی رہتی ہے اسی لیے تو چالیس روز اس کے لیے دعا کی جاتی ہے. اور یہ دعا عصر کے وقت کی جائے اور مرحوم کے گھر ہی میں کی جائے. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر جمعرات کو روحیں آتی ہیں.

(۳) جو لوگ مرجاتے ہیں کیا ان کی روحیں آپس میں ملتی ہیں؟

(۴) پردہ کن لوگوں سے کرنا چاہیے؟

(۵) کیا پھوپھا، خالو اور بہنوئی سے بھی پردہ کرنا چاہیے؟ سائلہ: بنتِ کرم خان جنڈ ضلع اٹک

جواب

(۱) ان بزرگ نے اگر واضح طور پر یہ کہا تھا کہ میرا پیسہ مرنے کے بعد مساجد ہی میں دیا جائے تو اب یہ پیسہ مساجد ہی کے لیے وقف سمجھا جائے گا. اور اس کو مساجد ہی میں دینا ضروری ہوگا. اس رقم کو کسی اور جگہ استعمال کرنا جائز نہیں. اور اگر انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا تو پھر اُن کی بھانجی یا کسی بھی اور غریب کو دے سکتے ہیں.

(۲) یہ سب من گھڑت باتیں ہیں، ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے. شریعت مطہرہ سے کوئی ایسی چیز ثابت نہیں.

(۳) جو لوگ مرجاتے ہیں اُن کی روحیں آپس میں ملتی ہیں.

(۴) عورت کو ہر اُس مرد سے پردہ کرنا ضروری ہے جس کے ساتھ اُس کا نکاح کسی بھی صورت میں جائز ہوسکتا ہو.

(۵) پھوپھا، خالو اور بہنوئی سے پردہ کرنا ضروری ہے.

(۱) في الدر المختار: شرط الواقف كنص الشارع اى في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به. (ج:٤، ص:٤٣٣)

(۲) كذا فی فتاویٰ الرشيدية، جديد، مبوب (ص: ٢٦٩)

(۳) وان ارواح الموتیٰ تتلاقی وتتزاور وتتذاکر.وقد تتلاقی ارواح الاموات والاحیاء مناماً. (روح المعانی، ج:۱۵، ص: ۲۰۶)

(٤،٥) ومن محرمه، هی من لایحل له نکاحها ابداً بنسب اوسبب ولو بزنا .

(الدرا لمختار، ج:٦، ص:٢٦٧)

سوال

مؤدبانہ التماس ہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کا نکاح تقریباً ۳ ماہ پہلے کیا تھا اور ابھی اس کی رخصتی نہیں ہوئی، ہماری بیٹی کو حج کا بہت شوق ہے.نکاح سے قبل اُس کے سُسر نے یہ بھی حامی بھری تھی کہ وہ شادی کے بعد ہماری بیٹی کو حج کروائیں گے لیکن وہ نکاح نامے میں کوئی بھی شرط رکھنے کو تیار نہ تھے یہ ہی وجہ ہے کہ اُس وقت نکاح نامے میں حق مہر کے علاوہ نہ تو کوئی شرط رکھی گئی اور نہ کوئی شِق پُر کروائی گئی.آپ سے التجا ہے کہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمادیں کہ کیا اب ہم نکاح میں (۱) کوئی ترمیم کرواسکتے ہیں (۲) کیا کوئی شِق پر کرواسکتے ہیں نیز (۳) کیا حج کی شرط لکھوا سکتے ہیں؟

علاوہ ازیں اگر ہم اُن سے طلاق لینا چاہیں تو کیا ہماری بیٹی کو شرعی طور پر عدت کی مدت پوری کرنی ہوگی یا ہم فوری طور پر اس کا دوسرا نکاح کر سکتے ہیں نیز طلاق کی صورت میں انہیں کتنا حق مہر دینا ہوگا اور اگر وہ لوگ حق مہر نہ دیں تو کیا طلاق ہوجائے گی یا نہیں؟ سائل: آپ کا ایک بھائی

جواب

صورت مسئولہ میں آپ لوگ اب نکاح نامے میں نہ تو کوئی شق مزید لکھوا سکتے ہیں اور نہ ہی حج کی شرط لکھوا سکتے ہیں.اس لیے کہ اب نکاح ہو چکا ہے یہ ساری چیزیں نکاح سے پہلے ہی طے کر لینی چاہیے تھیں.

اور طلاق کی صورت میں آپ کی بیٹی پر کوئی عدت نہیں آئے گی آپ طلاق کے فوراً بعد اس کا نکاح دوسری جگہ کر سکتے ہیں.اور اس صورت میں شوہر کے ذمہ آپ کی بیٹی کے لیے مہر واجب نہیں ہوگا.

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ .... الخ (سورة البقرة ،الآية :٢٣٦)

سوال

ایک خاتون جو کہ اب ایک بیٹے کی ماں ہے اور جس کی طلاق کو پونے دوسال گزر چکے .طلاق کے بعد خاتون کا خاوند اُن زیورات کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے جو کہ بوقت نکاح اُس نے منکوحہ کو پہنائے تھے اُن زیورات کی واپسی بارے شرعاً کیا حکم واقع ہوگا .کیا زیورات کی واپسی مسئلے کی رو سے کی جانی چاہیے؟ جب کہ خاتون پونے دوسال سے بچے کا خرچہ بھی برداشت کر رہی ہے.

سائل: کفایت اللہ میر پور آزاد کشمیر

جواب

اگر زیورات دیتے وقت یہ وضاحت کر دی گئی ہو کہ یہ عورت کی ملکیت ہیں یا وضاحت تو نہ کی گئی ہو لیکن رواج ایسا ہی ہو کہ وہ عورت کی ہی ملکیت سمجھے جاتے ہوں تو ان دونوں صورتوں میں وہ عورت ہی کی ملکیت شمار ہوں گے .اور خاوند کے لیے ان کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے.

اور اگر یہ وضاحت کر دی گئی ہو کہ یہ مرد ہی کی ملکیت ہیں ،عورت کو صرف استعمال کے لیے دئے جا رہے ہیں یا یہ وضاحت تو نہ کی گئی ہو لیکن وہاں رواج ایسا ہی ہو کہ وہ مرد ہی کی ملکیت سمجھے جاتے ہوں تو ان دونوں صورتوں میں وہ مرد ہی کی ملکیت ہوں گے اور وہ عورت سے ان کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے.

رہی یہ بات کہ عورت دوسال سے بچے کے اخراجات برداشت کر رہی ہے تو اس کا زیورات کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے. تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس تمام عرصے (پونے دوسال) کے دودھ پلانے کے اخراجات (عام رواج میں جس قدر بنتے ہوں) وہ شوہر کے ذمہ ہوں گے اور شوہر سے ان کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے.

کسی شخص پر سجدہ سہو واجب ہو اور وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کر لے تو جائز ہے کہ نہیں.

جواب

سجدہ سہو کا صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کیئے جائیں پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام

پھیرلے لیکن اگر کوئی شخص سلام پھیرنے سے پہلے ہی سجدہ کرلے تو یہ بھی جائز ہے۔ سجدہ سہو ادا ہو جائے گا لیکن جان بوجھ کر ایسا کرنا پسندیدہ نہیں۔

فی الدر: یجب له بعد السلام واحد ولو سجد قبل السلام جاز وكره تنزيهاً

(٦٥٢.٣/٢)

ولواتى بسجود السهو قبل السلام جاز عندنا ايضاً.

(فتح القدير، ٤٣٦/١)

کسی آدمی کو زخم ہو اور اس میں پیپ پڑ جائے۔ پھر وہ پیپ زخم کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف بہہ جائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں۔

جواب

اس صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔ ہاں اگر خون یا پیپ زخم کی حدود سے باہر نکل جائے اور بہہ پڑے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

فی الدر: كمالو سال فى باطن عين اوجرح او ذكر ولم يخرج، وفى ردالمحتار، ولم يخرج:اى لم يسل ، اقول :وفى السراج عن الينا بيع :الدم السائل على الجراحة اذا لم يتجاوز.

(٢٨٦/١)

دوران سفر سواری ایسی ہو کہ اُس سے اُتر کر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو اور اگر اُتر جائے تو سخت مشقت میں پڑنے کا اندیشہ ہو اور سواری کے اندر وضو کے لیے پانی بھی نہیں اور نہ ہی سواری میں قیام، رکوع، سجود ممکن ہیں۔ اور نہ ہی استقبال قبلہ ممکن ہے۔ ایسی صورت میں تیمّم کر کے اشارے کے ساتھ بلا استقبال قبلہ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا ایسی حالت میں پڑھی گئی نماز کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

جواب

مذکورہ صورتِ حال میں سواری کے اندر تیمّم کر کے اشارے کے ساتھ نماز پڑھ لے لیکن منزل پر پہنچ کر اس نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہوگا. کیونکہ یہاں نماز سے روکنے والی چیز بندوں کی طرف سے ہے ایسی صورت میں نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہوتا ہے.

فی فتاویٰ قاضیخان: الا سیر فی دارالحرب اذا منعہ الکافر عن الوضوء الصلوٰۃ تیمم ویصلی بالایماء ثم یعیدا اذا خرج.

(۲۹/۱)

سوال

اپنی نسبت کسی دوسری قوم کی طرف کرنا یا اپنا نسب اپنے باپ دادا کے علاوہ کسی اور سے بیان کرنا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے بعض لوگ اپنے آپ کو سید یا قریشی کہلاتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نہیں ہوتے کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب

ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے. اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے. حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اپنا نسب اپنے باپ دادا کے علاوہ کسی اور سے بیان کرے اس پر جنت حرام ہے.

عن سعد بن ابی وقاص رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما قالا: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ادعی الی غیر ابیہ وھو یعلم فالجنۃ علیہ حرام (متفق علیہ) عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا ترغبوا عن آبائکم فمن رغب عن ابیہ فقد کفر (متفق علیہ).

✡✡✡✡

(سید محمد ابوالخیر کشفی)

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟
افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟

کس نام سے ملتی ہے شفا اہلِ جہاں کو
کونین کو یہ حرفِ دعا کس سے ملا ہے؟

ہر نقش میں اک شانِ کریمی ہے خدا کی
یہ پردۂ انوار و ضیا کس سے ملا ہے؟

یہ دولتِ اندازِ نظر کس کا کرم ہے
یہ سلسلۂ فکرِ سا کس سے ملا ہے؟

سرکارِ دوعالم ﷺ کے سوا کون امیں ہے؟
اللہ کا پیغام ہدیٰ کس سے ملا ہے؟

اس ذاتِ محمد ﷺ کے سوا، کوئی بتائے
انسان کو مفہوم رضا کس سے ملا ہے؟

کشفی کو عطا کس سے ہوئے اشکِ محبت
آواز کو یہ رنگ صفا کس سے ملا ہے؟

(Monthly)
Al.Hamid

CPL:67
(LAHORE)